خاکہ نگاری کے عناصر: "جہانِ دِگر" از احسان دانش کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم-فل (اردو)

مقالہ نگار:

وسیم شہزاد

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۴ء

خاکہ نگاری کے عناصر: "جہانِ دِگر" از احسان دانش کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم-فل (اردو)

مقالہ نگار:

وسیم شہزاد

یہ مقالہ

ایم فل اُردو

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۴ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگو یجز کو اس مقالے کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: خاکہ نگاری کے عناصر: ”جہان دِگر“ از احسان دانش کا تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: وسیم شہزاد

رجسٹریشن نمبر: 35/MPhil/Urd/F21

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: (اردو زبان و ادب)

ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگو یجز

تاریخ: ____________________

اقرار نامہ

میں وسیم شہزاد اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ ہذا بعنوان "خاکہ نگاری کے عناصر: "جہان دِگر" از احسان دانش کا تجزیاتی مطالعہ "میرا ذاتی کام ہے۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان کی زیر نگرانی کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام اس سے پہلے کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں حصول سند کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کروں گا۔

وسیم شہزاد

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۴ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ کے دفاع اور منظوری کا فارم	III
اقرار نامہ	IV
فہرست ابواب	V
Abstract	VII
اظہار تشکر	VIII
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف، بنیادی مباحث	۱
الف۔ تمہید	۱
۱۔ موضوع کا تعارف	۱
۲۔ بیان مسئلہ	۲
۳۔ مقاصد تحقیق	۲
۴۔ تحقیقی سوالات	۳
۵۔ نظری دائرہ کار	۳
۶۔ تحقیقی طریقہ کار	۴
۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۴
۸۔ تحدید	۴
۹۔ پس منظری مطالعہ	۵
۱۰۔ تحقیق کی اہمیت	۵
بنیادی مباحث	۶
ب۔ خاکہ نگاری کے عناصر: جائزہ	۶
ج۔ اردو خاکہ نگاری کی روایت وارتقا	۱۴
د۔ جہانِ دگر کا تعارف	۱۹
حوالہ جات	۲۱

باب دوم: "جہانِ دگر" میں حلیہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ	۲۳
الف۔ باطنی خدوخال	۲۳
ب۔ ملبوس	۲۸
ج۔ چال ڈھال	۳۴
حوالہ جات	۳۹
باب سوم: "جہانِ دگر" میں شخصی عادات وخصائل کا تجزیاتی مطالعہ	۴۱
الف۔ معمولات وترجیحات	۴۱
ب۔ طرزِ نشست وبرخاست	۴۶
ج۔ عادات واطوار	۵۳
حوالہ جات	۶۰
باب چہارم: "جہانِ دگر" میں احوال و آثار کا تجزیاتی مطالعہ	۶۲
الف۔ شخصیت کی متوازن عکاسی	۶۲
ب۔ تہذیبی حقائق کی پیشکش	۶۶
ج۔ شخصی تاثر کی پیشکش	۷۱
حوالہ جات	۷۶
باب پنجم: ماحصل	۷۷
الف۔ مجموعی جائزہ	۷۷
ب۔ تحقیقی نتائج	۸۱
ج۔ سفارشات	۸۲
کتابیات	۸۳

ABSTRACT

The title of my Research, Thesis for my M.Phil. Urdu is “Elements of Sketch Writing: An Analytical Study of “Jahan e Digar” by Ehsan Danish”

The research under discussion is based on an analytical study of "Elements of Sketching: "Jahan-e-Digar" by Ehsan Danish. “Jahan-e-Digar” is a book of memoirs by Ehsan Danish. It was published by Khazeena Ilam o Adab from Lahore in 2001. He has sketched various personalities by establishing different titles. Among the titles established by Ehsan Danish are Chandni Ke Sai, Police, funkaar, Usataza Punjab University aor Deegar Mu'alameen, and Sahafat par Lamah-e-Fikar are included. Ehsan uses brief encounters with individuals as the foundation to express opinions on aspects of their personalities in a way that is often gone unnoticed by common people.

The biographical sketches presented by Ehsan in these brief accounts include elements of personal habits, posture, traits circumstances and influences. The proposed research will provide analytical insights of these elements. Through this, valuable information can be provided about the representative people of that time. By applying these elements to the reader, the inner traits of the personality, their attire, mannerisms, routines and preferences, meeting and dismissal, habits and behavior, balanced reflection of personality, presentation of cultural facts, and the personal impression they left behind can provide abundant valuable knowledge about them. From which the reader will be able to gain awareness of Ehsan's time and Ehsan's own situations and personal experiences.

اظہار تشکر

ربِ کریم کی عنایات اور فضل و کرم کے کیا کہنے، کہ مجھ جیسا بندہ حقیر آج ایم فل کا اظہار تشکر لکھ رہا ہے۔ اِس سے بڑی خوش قسمتی میرے لیے کیا ہو سکتی ہے کہ میں نے نمل جیسے بڑے باوقار ادارے سے تعلیم حاصل کی۔ جہاں علم و ادب کے بڑے بڑے پہاڑ اپنی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ بلاشبہ تحقیقی کام کی راہ بہت مشکل ہوتی ہے۔ جس میں تلوار کی نُوک پر چلنا پڑتا ہے اور ہر لمحے یہ خیال کہ اگر میں نہ کر پایا تو کیا ہو گا۔ اُس کے ساتھ ساتھ ملازمت مگر اللہ تعالی کی ذات نے میری زندگی میں ایسے بے شمار اشخاص بطورِ وسیلہ بھیجے جن کا میں یہاں فرداً فرداً ذکر نہ کروں تو میری تحریر بوجھل اور نامکمل رہے گی۔

اُن میں سب سے پہلا نام ڈاکٹر صائمہ نذیر کا ہے اپنے پورے ادبی قد کاٹھ کے ساتھ سکالرز کے مسائل کو حل کرنے میں مصروفِ کار نظر آتی ہیں۔ ہر مشکل مرلے پر آپ نے میرا ساتھ دیا اُس کے لیے میں اُن کا احسان مند ہوں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ استاد کی رہنمائی کے بغیر تحقیقی مرحلہ طے کرنا تو درکُنار اس کا آغاز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اُس کے لیے میں اپنی نگران ڈاکٹر عنبرین تبسم کا بھی شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے کٹھن لمحات میں مجھے مفید مشورے دیے اور اپنے مخصوص رویے سے میرا حوصلہ بڑھایا۔

یہاں میں مزید تین نام خصوصیت سے لینا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر عابد سیال اور ڈاکٹر نعیم مظہر جو نمل میں عجز و انکساری کے پہاڑ ہیں۔ جن کی ماہرانہ رائے اور دعاؤں سے یہ مرحلہ سر ہوا۔ اُس کے علاوہ میں اُن اساتذہ کا بھی احسان مند ہوں جنہوں نے ہمیں نصاب پڑھایا اُن میں ہمارے مرشد سر ڈاکٹر محمود الحسن کے ساتھ ساتھ میم ڈاکٹر صنوبر الطاف، ڈاکٹر بشریٰ پروین، ڈاکٹر نازیہ یونس کا بھی شکر گزار ہوں اور اس پر میں فخر محسوس کروں گا کہ میں نے ان سے پڑھا۔

ڈاکٹر عثمان غنی کا نام بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے آپ کا میں اس لیے شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری توجہ اس موضوع کی جانب مبذول کرائی۔ اس سارے کام ہیں میرے والدین کی دعائیں بھی شاملِ حال تھی لہٰذا اُن کا مجھ پر ایسا احسان ہے جو میں پوری زندگی نہیں اُتار سکتا۔ اریب شہروز جن کے پاس میں رہا یہ مشکل وقت میں میرا ساتھ دیتے رہے۔ بھائیوں میں خرم شہزاد، قمر شہزاد، سیاوش ممتاز اور عامر اعجاز کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے قیمتی لمحات میں سے مجھے وقت دیا اور خبر گیری کرتے رہے۔ اس کے علاوہ ماموں زاد حسن شہزاد، عمر شہزاد اور محمد مدثر کا بھی مشکور ہوں جو گام بہ گام میرے ساتھ کھڑے رہے۔

دوستوں میں عادل رضاخٹک، محمد مدثر، فراز موسم، شاہد شوق، ذیشان مرتضیٰ، محسن وقاص، شہباز گِل، سر یاسر رشید، نبیل ساجد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ تممت بالخیر سے قبل میں بارگاہِ الٰہی میں اپنی کم مائیگی کا اعتراف کرتا ہوں۔ کیونکہ آپ کے کرم کے بغیر میں اس قابل ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اپنے قلم کی پرواز جاری رکھ سکوں۔

وسیم شہزاد

سکالر ایم۔ فِل اُردو

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید:

i۔ موضوع کا تعارف(INTRODUCTION)

مجوزہ تحقیقی موضوع خاکہ نگاری کے عناصر: "جہانِ دِگر" از احسان دانش کا تجزیاتی مطالعہ پر مبنی ہے۔ خاکہ نگاری اردو ادب کی ایک اہم نثری صنف ہے۔ خاکے میں شخصیت کے تفصیلی حالات و واقعات یا اس کے کارناموں اور فتوحات کا ذِکر نہیں کیا جاتا، بلکہ کسی واقعے کے مختصر تذکرے سے شخصیت کا کوئی خاص پہلو قارئین کے سامنے لایا جاتا ہے۔

خاکہ نگاری کے عناصر میں حلیہ نگاری، شخصی عادات و خصائل، اختصار، کردار نگاری، احوال و آثار، وحدتِ تاثر، منظر کشی شامل ہیں۔ کسی بھی صنف کا اظہار یک دم نہیں ہوتا بلکہ ایک طویل عرصے تک وہ شکل و صورت نکھارنے کے بعد اپنی حثیت واضح کرنے کے ساتھ مقبولیت کا درجہ پاتی ہے۔ اس کے اصول و قواعد بن جاتے ہیں جن میں وقتاً فوقتاً پختگی آتی ہے اور پھر سالوں بعد وہ ایک منظم صورت میں ایک ایسی شکل اختیار کر لیتی کہ اس کی تعریف اور وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ اس صنف کا ایک حوالہ بن جاتا ہے۔ یہ مراحل مختلف اضاف کے لیے مختلف ہوتے ہیں، اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کی مقبولیت اور رجحان کی شرح کیا ہے؟ اور لکھنے والے اس پر کس قدر توجہ دے پاتے ہیں۔ اہلِ فن کو اس صنف کے کے اصول وضوابط کے تعین کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟

اردو کے غیر افسانوی نثر میں خاکہ نگاری کو ایک اہم اور منفرد مقام حاصل ہے۔ خاکہ نگاری کی اصطلاح زیادہ قدیم نہیں۔ صحیح معنوں میں اس کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا۔ البتہ اس کے نمونے قدیم نثری اضاف میں ملتے ہیں۔ قدیم فارسی اور اردو تذکروں اور سوانحی مضامین میں خاکہ نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں جن تذکرہ نگاروں نے اردو شعراء کے حالات پر توجہ دینا شروع کی تو تذکروں میں جابجا ایسے بیانات دکھائی دینے لگے جس میں شاعر کے کلام کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کا ایک دھندلا عکس بھی قاری کے سامنے آنے لگا۔ میر کے ''نکات الشعراء'' اور محمد حسین آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' میں ایسے نمونے جابجا بکھرے پڑے ہیں اور دیگر تذکروں میں بھی خاکے کے نقوش دھونڈے جاسکتے ہیں۔ تذکروں اور ادبی تاریخوں کے علاوہ سوانحی

کتابوں میں بھی خاکوں کے نمونے مل جاتے ہیں۔ آپ بیتی کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ممکن نہیں کہ کوئی آپ بیتی کسی دوسرے شخص کے عمومی یا خصوصی تذکرے سے بلکل خالی ہو۔ آپ بیتی میں مختلف شخصیات کے ساتھ تعلقات کا اظہار ہوتا ہے اور اسی اظہار میں دوسری شخصیت کے دلچسپ عناصر بھی لکھ دیئے جاتے ہیں جو خاکوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ غرض یہ کہ ادبی تاریخ نویسی، سوانح عمریاں، خطوط اور آپ بیتیاں سبھی میں اردو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کہیں کم کہیں زیادہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ مکمل خاکے تو نہیں، خاکوں کے عناصر ہیں لیکن خاکہ نگاری کی روایت میں ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ کسی بھی صنف کی روایت کے ارتقاء میں ایسے تمام تر نمونوں کو اہمیت دی جاتی ہے جہاں سے گزر کر وہ صنف دورِ جدید تک پہنچتی ہے۔

"جہانِ دِگر"احسان دانش کے لکھے ہوئے تذکروں کی کتاب ہے۔اسے خزینہ علم وادب سے ۲۰۰۱ءمیں شائع کیا گیا۔اس کتاب میں مصنف نے اپنے تمام دوست احباب اوراُس زمانے کے معتبر لوگوں سے بالمشافہ ملاقات کے بعد اُن کا تذکرہ کیا ہے۔احسان دانش کی جن اصحاب سے ملاقاتیں رہی ہیں وہی تذکرے کو بنیاد بنا کر لکھتے ہیں اور شخصیت کے ایسے پہلوپر اظہارِ خیال کرتے ہیں جو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔

مجوزہ تحقیقی کام کے ذریعے اس زمانے کے نمائندہ لوگوں کی حلیہ نگاری، شخصی عادات وخصائل اور احوال و آثار کے تحت بیش قیمت معلومات مہیا ہو سکتی ہیں۔ مجوزہ تحقیقی موضوع میں اِن کا انطباق کیا ہے۔

ii۔بیانِ مسئلہ (THESIS STATEMENT)

اردو ادب بہت سے موضوعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ مجوزہ تحقیقی موضوع " خاکہ نگاری کے عناصر:" جہان دگر " از احسان دانش کا تجزیاتی مطالعہ " پر مبنی ہے۔ حلیہ نگاری، شخصی عادات وخصائل، احوال و آثار خاکے کے عناصر میں شامل ہیں۔ آپ بیتی اور خاکے پر اس سے قبل کام ہو چکا ہے مگر مجوزہ موضوع پر اس سے قبل کام نہیں ہوا۔ اس تحقیق میں یہ دیکھا ہے کہ " جہان دگر " میں حلیہ نگاری، شخصی عادات وخصائل اور احوال و آثار کی نوعیت کیا ہے۔

iii۔مقاصد تحقیق(RESEARCH OBJECTIVES)

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں۔

ا۔"جہان دگر" میں حلیہ نگاری کا مطالعہ کرنا

۲۔جہان دگر" میں شخصی عادات وخصائل کا تجزیہ کرنا

۳۔جہان دگر" میں احوال و آثار کا جائزہ لینا

iv۔ تحقیقی سوالات (RESEARCH QUESTIONS)

زیر نظر تحقیق کے لیے درج ذیل سوالات پیش نظر رہیں گے۔

ا۔"جہان دگر" میں حلیہ نگاری کی نوعیت کیا ہے؟

۲۔"جہان دگر" میں شخصی عادات وخصائل کی عکاسی کیسے کی گئی ہے؟

۳۔"جہان دگر" میں احوال و آثار کی پیش کش کس طور کی گئی ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار(THEORETICAL FRAMEWORK)

مجوزہ تحقیقی موضوع "خاکہ نگاری کے عناصر:"جہان دگر" از احسان دانش کا تجزیاتی مطالعہ پر مبنی ہے۔ اس مطالعے کے لیے ڈاکٹر بشیر سیفی، ڈاکٹر انور سدید، وہاب عندلیب، ڈاکٹر سلیم اختر، محمد طفیل اور دیگر اہم اردو ناقدین کی آراء کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً خاکہ نگاری کے حوالے سے ایک معروف شخصیت محمد طفیل اس ضمن میں لکھتے ہیں۔"جو شخص جیسا ہے وہ وہی کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے اندر بہت کچھ چھپا ہوتا ہے۔ شخصیت سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے اسے صرف زمین پر چلتے پھرتے دیکھ لینا شخصیت سے آگاہی کے ذیل میں نہیں آتا۔ شخصیت سے آگاہی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی دبے پاؤں چھپی ہوئی شخصیت میں اتر جائے۔" مندرجہ بالا تعریف سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ظاہر کے ساتھ باطنی خدوخال سے بھی واقفیت ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ بھی ناقدین کی آراء موجود ہیں۔ جن سے خاکے کی وضاحت عناصر اور اصول نظر آتے ہیں۔

خاکے کے اصول درج ذیل ہیں:۔

ا۔خاکہ نگار کو انسانی نفسیات پر عبور ہونا چاہیے۔

۲۔خاکہ نگاری کی زبان سادہ، شگفتہ، بے ساختہ رواں، بلیغ اور پہلو دار ہونی چاہیے۔

۳۔خاکہ نگار متعلقہ شخصیت کے نقوش اس طرح ابھار دے کہ اس کی خوبیاں اور برائیاں اجاگر ہو جائیں۔

۴۔خاکہ اس طرح ترتیب دیا جائے کہ متعلقہ شخص کی جیتی جاگتی تصویر قاری کے پیش نظر ہو جائے۔

۵۔ قلمی خاکہ در اصل شکل وصورت اور کردار و نظریات کی ایک قلمی تصویر ہوتا ہے اس لیے خاکہ نگار کو چاہیے کہ متعلقہ شخصیت کی شکل وصورت، وضع قطع، سیرت و کردار کی صحیح اور جامع تصویر مرتب کرے۔

۶۔ مجوزہ تحقیقی کام کے لیے ناقدین کی آراء اور خاکے کے مندرجہ بالا اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے کام کیا ہے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار (RESEARCH METHODOLOGY)

مجوزہ تحقیقی مقالے کے لیے کیفیتی و تشریحی طریقہ کار استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ بنیادی و ثانوی ماخذات، رسائل و جرائد، تبصروں اور تجزیوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ نمونے کے طور پر جامعات میں ہونے والے تحقیقی مقالات کو بھی سامنے رکھا ہے۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق (WORKS ALREADY DONE)

مجوزہ موضوع کے تحت احسان دانش کی آپ بیتی "جہانِ دِگر" کو شامل کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر اس سے قبل کام نہیں ہوا۔ البتہ اس سے قبل موضوع شخصیات اور خاکے پر درج ذیل کام ہو چکا ہے۔

۱۔ احسان دانش کے فکر و فن کا تحقیقی مطالعہ، مقالہ برائے ایم۔ فل اردو، مملوکہ جامعہ کراچی

۲۔ سید کامران عباس کاظمی، سعادت حسن منٹو بطور مضمون نگار اور خاکہ نگار (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)، مقالہ برائے ایم۔ فل اردو، مملوکہ جامعہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

۳۔ گل ناز بانو، صوبہ سرحد میں خاکہ نگاری، مقالہ برائے ایم۔ فل اردو، مملوکہ جامعہ پشاور

۴۔ محمد عباس، پاکستان میں خاکہ نگاری ۱۹۹۱ء تا ۲۰۰۵ء، مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی اردو، مملوکہ جامعہ قرطبہ یونیورسٹی، پشاور

۵۔ محمد عزیر، پاکستانی اردو خاکہ نگاری میں طنز و مزاح کے عناصر (منتخب خاکہ نگاروں کے حوالے سے)، مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی اردو، مملوکہ جامعہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء

۶۔ ملیحہ وزیر حسین، آپ بیتی کا فن اور جہان دانش، مقالہ برائے ایم۔ فل اردو، مملوکہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

viii۔ تحدید (DELIMITATION)

مجوزہ تحقیقی موضوع "خاکہ نگاری کے عناصر: "جہان دگر" از احسان دانش کا تجزیاتی مطالعہ" پر مبنی ہے۔ "جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے مختلف شخصیات کے تذکرے لکھے ہیں۔ "جہان دِگر" صحیح معنوں میں "جہانِ دانش" کا ہی دوسرا حصہ ہے۔ کیوں کہ "جہان دانش" احسان دانش کی خود نوشت ہے اور اس خود نوشت میں احسان دانش نے اپنے خاندانی حالات، وطن، آبائی ماحول اور ادبی ماحول پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ انہوں نے مختلف

شخصیات کے تذکرے بھی بیان کیے ہیں مگر ان تذکرے کا حسن یہ ہے کہ انہیں اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان تذکروں پر خاکہ نگاری کے عناصر کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا تھا جبکہ "جہانِ دیگر" جو کہ تذکروں پر مبنی کتاب ہے اور "جہانِ دانش" کی نسبتاً اس پر تحقیقی کام بھی کم ہوا ہے۔ جبکہ "جہانِ دیگر" کے تذکروں میں خاکے کے جو عناصر دکھائی دیتے ہیں وہ خاص تجزیہ کے متقاضی ہیں۔ مزید براں "جہانِ دیگر" کردار نگاری اور بیانیہ انداز زیادہ متنوع اور دلچسپ ہے۔ اس لیے "جہانِ دیگر" کا انتخاب کیا گیا ہے۔ "جہانِ دیگر" میں موجود تذکروں میں بھی صرف انہی تذکروں کو تحقیق کا حصہ بنایا گیا ہے جو خاکہ نگاری کے اصولوں پر پورا اترتے ہیں۔ خاکہ نگاری کے عناصر میں سے بھی حلیہ نگاری، شخصی عادات و خصائل اور احوال و آثار کا تجزیہ کیا جائے گا۔

ix۔ پس منظری مطالعہ (LITERATURE REVIEW)

پس منظری مطالعہ مجوزہ موضوع کے انتخاب سے پہلے احسان دانش کی کتاب "جہانِ دِگر" کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی کتاب "اصناف ادب کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ خاکے کے لیے ڈاکٹر انور سدید کی کتاب "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ"، ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی کتاب "ادبی اصطلاحات کا تعارف" یحییٰ امجد کی کتاب "فن اور فیصلے" اور ڈاکٹر بشیر سیفی کی کتاب "خاکہ نگاری فن اور تنقید" کا مطالعہ بھی پیش نظر رہا ہے۔

x۔ تحقیق کی اہمیت (SIGNIFICANCE OF STUDY)

مجوزہ موضوع "خاکہ نگاری کے عناصر: "جہان دگر" از احسان دانش کا تجزیاتی مطالعہ پر مبنی ہے۔ یہ کام ایک منفرد تحقیق ہے۔ تذکرہ نویسی اور خاکے پر اس سے قبل کام نظر آتا ہے مگر تذکرہ نویسی میں خاکے کے عناصر تلاش کرنا اس کا تجزیہ کرنا اس تحقیق کا خاصہ ہے۔ اس کام سے تذکرہ نویسی میں خاکے کے عناصر (حلیہ نگاری، شخصی عادات و خصائل اور احوال و آثار) کے خدوخال واضح ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کام کی ادبی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے بین الاصناف طرز کے تحقیقی کاموں کے لیے راہ ہموار ہوئی ہے۔

خاکہ کیا ہے؟ خاکہ دراصل ایک ایسا شخصی مضمون ہے جس میں کسی شخصیت کے اہم، نمایاں اور منفرد پہلوؤں کو اس طرح اُجاگر کیا جائے کہ وہ شخصیت ایک جیتی جاگتی، چلتی پھرتی متحرک صورت میں قاری کے سامنے آجائے۔

اردو اصنافِ ادب میں خاکہ نگاری کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اِس کا شمار غیر افسانوی نثر میں کیا جاتا ہے۔ خاکے کی اصلاح زیادہ پرانی نہیں البتہ اس کے نمونے قدیم نثری اصناف میں ملتے ہیں۔ کوئی بھی صنف اچانک وجود میں نہیں آتی بلکہ وہ ایک لمبے عرصے تک شکل و صورت نکھارنے کے بعد مقبولیت کے درجے تک پہنچتی ہے۔ یہ

مراحل ہر صنف کے لیے مختلف ہوتے ہیں۔ خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی میں ہوتا ہے۔ اس صنف کو بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دھائی میں برتا گیا ہے اور اس کے فنی لوازم کے تعین کی ابتدائی کوشش بھی بیسویں صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں ملتی ہے۔

خاکے کی اصلاح زیادہ پرانی نہیں۔ البتہ اس کے نمونے قدیم نثری اصناف میں نظر آتے ہیں۔ قدیم فارسی اردو تذکروں اور سوانحی مضمون میں خاکہ نگاری کے نمونے ملتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں جن تذکرہ نگاروں نے اردو شعراء کے حالات پر توجہ دینا شروع کی تو تذکروں میں جابجا ایسے بیانات دکھائی دینے لگے جس میں شاعر کے کلام کے ساتھ ان کی شخصیت کا دھندلا عکس بھی نظر آنے لگا۔ میر کی تصنیف " نکات الشعراء" اور محمد حسین آزاد کی کتاب " آبِ حیات" میں ایسے نمونے کثرت سے ملتے ہیں اور دیگر تذکروں میں بھی خاکے کے نقوش ڈھونڈے جاسکتے ہیں۔ " جہانِ دِگر" میں بھی احسان دانش نے مختلف شخصیات کے تذکرے قلمبند کیے ہیں۔ اِس مقالے میں " جہانِ دِگر" میں بیان کیے گئے تذکروں میں خاکے کے عناصر کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے گا۔

بنیادی مباحث:

خاکہ کیا ہے ؟ خاکہ دراصل ایک ایسا شخصی مضمون ہے جس میں کسی شخصیت کے اہم، نمایاں اور منفرد پہلوؤں کو اس طرح اُجاگر کیا جائے کہ وہ شخصیت ایک جیتی جاگتی، چلتی پھرتی متحرک صورت میں قاری کے سامنے آجائے۔

اردو اصنافِ ادب میں خاکہ نگاری کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اِس کا شمار غیر افسانوی نثر میں کیا جاتا ہے۔ خاکے کی اصلاح زیادہ پرانی نہیں البتہ اس کے نمونے قدیم نثری اصناف میں ملتے ہیں۔ کوئی بھی صنف اچانک وجود میں نہیں آتی بلکہ وہ ایک لمبے عرصے تک شکل وصورت نکھارنے کے بعد مقبولیت کے درجے تک پہنچتی ہے۔ یہ مراحل ہر صنف کے لیے مختلف ہوتے ہیں۔ خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی میں ہوتا ہے۔ اس صنف کو بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں برتا گیا ہے اور اس کے فنی لوازم کے تعین کی ابتدائی کوشش بھی بیسویں صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں ملتی ہے۔

ب۔ خاکہ نگاری کے عناصر: جائزہ:

خاکہ نگاری فنِ نوخیز ہے۔ پچھلے چند برسوں میں اس نے ایک فن کی صورت اختیار کرلی ہے۔ صحیح معنوں میں بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں اس کی تعریف کی طرف توجہ کی گئی۔ اس حوالے سے بہت سے محققین نے اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ بعد میں محققین اور ناقدین نے اس کی صحیح تعریف وضع کرنے کی کوشش کی۔ ماہرین و

ناقدین نے اس کی حدود و قیود کا جو تعین کیا ہے ذیل میں اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ خاکہ نگاری کے بارے میں محمد حسین آزاد نے اولین تعریف جو کراچی میں لکھی تھی وہ یوں ہے۔

"خاکہ صفحہ قرطاس پر نوک کے قلم سے بنائی ہوئی ایک شبیہ ہے، یہ بے جان ساکت اور گم سم نہیں ہوتی، یہ بولتی ہوئی متحرک، پُر کیف تصویر ہوتی ہے، ایک مصور یا بت تراش کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ اس پیکر میں کسی دل پذیر تیور کی جھلک بھی دے دے مگر ایسی تصویر بنانا مصور، بت تراش یا فوٹو گرافر کے بس سے باہر ہے جسے دیکھ کر ہم فرد کی سیرت اور انفرادیت کا بھی اندازہ کریں۔"(۱)

اس تعریف میں محمد حسین آزاد خاکے کے دو اہم عناصر کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہیں کہ ایک تو یہ بے جان نہیں ہوتی۔ یعنی متحرک صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ دوسرا عُنصر یہ نظر آتا ہے کہ اسے شخصیت کی سیرت اور انفرادیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ انفرادیت اس حوالے سے ہے کہ اس صورت میں مجلسی و انفرادی زندگی کے وہ گوشے سامنے لائے جاتے ہیں جو عموم سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ یہی شخصیت کا خاصہ ہے۔

ڈاکٹر محمد عمر رضا خاکے کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"خاکہ در اصل انگریزی لفظ sketch کے مترادف ہے جس کے معنی کچا نقشہ، ڈھانچہ، یا لکیروں کی مدد سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں لیکن ادبی اصلاح میں اس سے مراد وہ نثری تحریر ہے جس میں نہایت مختصر طور پر اشارے کنائے میں کسی شخصیت کا ناک نقشہ، عادات و اطوار اور کردار کو سیدھے سادے انداز اور روانی کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں کسی ایک فرد کے مختلف گوشوں کی اس انداز سے حقیقی اور جیتی جاگتی تصویر پیش کی جاتی ہے جس سے فرد کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔"(۲)

اس تعریف میں ڈاکٹر عمر رضا اس بات کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ خاکہ نثری تحریر ہے۔ اختصار کے عُنصر کے ساتھ شکل و صورت اور عادات و اطوار کو دلچسپ پیرائے میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ اِس کے ساتھ روانی کے عُنصر کا ہونا بھی لازمی ہے۔ لہٰذا اس کی عکاسی ایسے کرنی چاہیے کہ وہ شخصیت عملی صورت میں ہمارے سامنے آجائے۔

امجد کندیانی "نگار" کے اصنافِ ادب میں یوں رقمطراز ہیں:

"خاکے میں تو کسی شخصیت کو جیسی وہ ہوتی ہے من و عن ویسا ہی پیش کر دیا جاتا ہے اِسے اچھا یا بُرا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کی زندگی کے مختلف واقعات کا علمی بصیرت سے انتخاب کر کے پوری فنی مہارت سے ان کی ترتیب قائم کی جاتی ہے اور یوں زندہ شخصیت سامنے آتی ہے۔ اچھے خاکہ نگار کا نقطہ نظر ضرور ہمدردانہ ہوتا ہے لیکن وہ حتیٰ الوسع غیر جانبدار ہی رہتا ہے۔"(۳)

درج بالا تعریف سے پتہ چلتا ہے کہ غیر جانبداری سے کسی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہوئے خاکہ نگار شخصیت کے بنیادی اوصاف ڈھونڈ نکالتا ہے اور اِن کے انتخاب میں بھی غیر جانبدارانہ رویہ اپناتا ہے۔ اور اُس کا نقطہ نظر ہمدردانہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ درج بالا تعریف میں اشارہ نظر آتا ہے۔

ساجد صدیق نظامی خاکے کی تعریف میں یوں رقم طراز ہیں: "کسی شخصیت کے بارے میں ایسا نثر پارہ جو اس شخصیت کی چلتی پھرتی تصویر تشکیل دے سکے۔"(۴) ڈاکٹر بشیر سیفی جنہوں نے خاکے کے حوالے سے اہم کام کیا ہے اور انہوں نے خاکے کے ابتدائی نقوش مرتب کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لوازم پر اُن کی بحث ملتی ہے وہ خاکہ نگاری کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> "سکیچ مصوری کی اصطلاح ہے جس میں چند لکیروں کی مدد سے کسی شخص کے چہرے کے خدوخال واضح کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا ادب کی اس صنف میں الفاظ کی وہی اہمیت ہے جو مصوری میں لکیروں کی ہے۔ بنابریں اختصار خاکہ کی بنیادی خوبی قرار پاتی ہے۔ خاکہ نگار کو کم سے کم الفاظ میں شخصیت کے نمایاں اوصاف اُجاگر کرنا ہوتے ہیں۔ یہ کام ایک خاص سلیقے اور دقتِ نظر کا طالب ہے کیونکہ خاکہ نگار کے پاس واقعات و تاثرات کا انبار ہوتا ہے اور اسے ان میں سے ایسے واقعات کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جن کے آئینے میں پوری شخصیت کا عکس نظر آئے کیونکہ غیر ضروری تفصیلات اور واقعات کی بھرمار سے خاکے کا تاثر مجروح ہوتا ہے۔"(۵)

درج بالا تعریف میں ڈاکٹر بشیر سیفی اختصار کو خاکے کی خوبی قرار دیتے ہیں۔ جس طرح ناول مفصل صنفِ ادب ہے اور اس کے مقابلے میں افسانہ ایسی طرزِ تحریر ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھا جاسکتا ہے۔ اِسی طرح سوانح میں کسی شخصیت کے بارے میں پڑھنا بھی مشکل کام ہے اور اس کی نسبت خاکہ ایک ایسی طرزِ تحریر ہے جس میں کسی شخص کی عادات و اطوار اور مجلسی زندگی کے بارے میں جانا جاسکتا ہے۔ طویل خاکے ابھی بھی لکھے جاتے ہیں مگر اِن میں کسی شخصیت کی زندگی کے اہم گوشے ہی سامنے لائے جاتے ہیں اور یہ کام کافی دلچسپ بھی ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ ڈاکٹر بشیر سیفی درج بالا تعریف میں اِس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ خاکے میں غیر ضروری واقعات نہیں ہونے چاہیے بلکہ ایسے واقعات کا انتخاب کیا جائے جس سے شخصیت مکمل طور پر واضح ہو سکے۔ تیسری چیز جو اِس تعریف میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خاکے کو ہم مصوری میں بنائی جانے والی تصویر کی لکیروں سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں جتنی اہمیت وہاں لکیروں کی ہے اتنی ہی اہمیت یہاں لکھے جانے والے الفاظ کی ہے۔ وہاب عندلیب اِس ضمن میں لکھتے ہیں:

"خاکہ نگاری، خاکہ اُڑانے کا نام نہیں ہے اور نہ ہی یہ توصیف نامہ ہے۔ یہ فن سوانح عمری اور تاریخ نویسی سے بھی مختلف ہے۔ خاکہ نگاری کو نثر میں غزل کا فن اشاروں کا آرٹ اور دریا کو کوزے میں بند کر دینے یا قطرہ میں دجلہ دکھانے کی تکنیک قرار دیا گیا ہے۔ گویا خاکہ نگاری، اختصار تاثر اور کردار نگاری سے عبارت ہے۔ خاکہ نگاری شخصیت کا معروضی مطالعہ ہے اور ادراک ہے۔ جس کے ذریعے موضوع کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ عموماً یہ مطالعہ اور ادراک ہمدردانہ ہوتا ہے۔"(۶)

وہاب عندلیب نے خاکے کی حدود و قیود کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اختصار، کردار نگاری اور تاثر کو خاکے کے بنیادی عناصر قرار دیتے ہیں اور شخصیت کے معروضی مطالعے اور ادراک کو اہم قرار دیتے ہوئے خاکے کی ایک بہترین تعریف وضع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر تنقیدی اصطلاحات: توضیحی لغت میں رقم طراز ہیں:

"انگریزی sketch کے لیے مستعمل اصطلاح خاکہ اس مختصر تحریر کے لیے استعمال ہوتی ہے جو کسی فرد کے بارے میں شخصی تعلقات، نجی کوائف اور ذاتی احوال پر مبنی ہو۔ اسے شخصیت نگاری کی مختصر ترین صورت بھی قرار دیا جاسکتا ہے، اگر سوانحی عمری ناول ہے تو پھر خاکہ کو مختصر افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ اگر پینٹنگ کی اصطلاح میں بات کریں تو خاکہ "Miniature کے مماثل نظر آتا ہے۔"(۷)

اِس تعریف میں ڈاکٹر سلیم اختر خاکے کو شخصیت نگاری کی مختصر ترین صورت قرار دیتے ہیں۔ اور اِس کے ساتھ اِسے مختصر افسانے سے بھی تشبیہ دیتے ہیں۔ اگر ناول کو سوانح عمری کی قبیل سے مانا جاسکتا ہے تو پھر خاکے کو مختصر افسانے کی طرز پہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس طرح افسانہ ایک نشست میں پڑھا جاسکتا ہے اسی طرح خاکہ بھی آدمی ایک نشست میں پڑھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر صابرہ سعید کی خاکہ نگاری کے حوالے سے تعریف قابلِ التفات ہے، وہ اِس بارے میں لکھتی ہیں:

"خاکہ ایک صنفِ ادب ہے۔ اِس کا سانچہ انشائیہ کا ہوتا ہے اور اس میں کسی شخصیت (حقیقی یا خیالی) کی زندگی سیرت و صورت اور کارناموں کی کچھ جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں اور وہ شخصیت کے ایک ایسے مطالعے کو پیش کرتا ہے جس سے پڑھنے والے کو ایک جمالیاتی حظ حاصل ہو۔"(۸)

ہر محقق اور نقاد نے خاکے کی تعریف کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کی وضاحت کے لیے اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی خیال اور نظریہ تمام محققین کے ہاں ایک ہی ہے۔ الگ الگ الفاظ اور زاویے سے بیان کرنا اِن کی اپنی تفہیم ہے اور ان کا اپنا خیال ہے۔

ڈاکٹر طلعت خلجی خاکے کے اس ضمن میں لکھتی ہیں کہ:

> "اس فن (خاکہ نگاری) کی خوبی یہ کہ (خاکہ نگار) کی قوت مشاہدہ پر گہری نظر ہو، شخصیت کا بیان جانبدارانہ انداز سے اس طرح پیش کیا جائے کہ شخصیت اپنے پورے وزن و وقار کے ساتھ قاری کی نگاہوں کے سامنے گھوم جائے۔ گویا وہ بہ الفاظ قلم اس شخص کی تصویر دیکھ رہا ہو۔ اسلوب بیان نہایت اچھوتا ہو۔"(۹)

ڈاکٹر طلعت خلجی کی درج بالا تعریف سے جو نکات سامنے آتے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ ایک تو عملی زندگی کی لفظی تصویر پیش کرنا اور اُسے دلچسپ انداز سے پیش کیا جائے کہ وہ جس طرح شخصیت موجود ہے۔ اس تعریف میں ڈاکٹر طلعت خلجی نے "جانبدرانہ" انداز لکھا ہے یہ بات قابلِ تحقیق ہے کہ اُن کا نقطہ نظر یہی تھا یا کمپوزنگ کی غلطی ہے۔ وہ اس لیے کہ باقی محققین نے غیر جانبدارانہ انداز لکھا ہے اور یہی خاکے کی جان ہے۔

پروفیسر انور جمال اس ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

> "کسی شخصیت کے بارے میں ایسا سوانحی مضمون "خاکہ" کہلاتا ہے جو معروضی ہوتا ہے لیکن صرف سوانحی نہیں ہوتا- خاکے میں زیرِ بحث شخصیت کی زندگی کے دلچسپ، نمایاں اور نسبتاً متنازع پہلو، نیم مزاحیہ انداز میں اس طرح پیش کیے جاتے ہیں کہ اس شخصیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ خاکے میں کسی شخصیت کی زندگی کے پورے واقعات یا ان کا تسلسل نہیں ہوتا صرف چند منتخب واقعات جھلکیوں کی صورت میں مصور کر دیے جاتے ہیں۔"(۱۰)

درج بالا تعریف میں پروفیسر انور جمال اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ خاکہ اپنے اندر معروضی طرز رکھتا ہے۔ نمایاں پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ اِس سے شخصیت نکھری ہوئی اور متحرک ہو کر سامنے آئے۔ نیز اس تعریف کے مطابق مزاحیہ انداز بھی لازمی ہے۔ کسی بھی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اہم واقعات کا انتخاب کیا جاتا ہے نہ کہ تسلسل کے ساتھ واقعات کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ یحییٰ امجد اپنے مضمون "اردو خاکہ نگاری" میں خاکے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" خاکہ میں کسی شخصیت کی جیسی وہ ہوتی ہے من و عن ویسا پیش کر دیا جاتا ہے۔ اسے اچھا یا برا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کی زندگی کے مختلف واقعات کا عملی بصیرت سے انتخاب کر کے پوری فنی مہارت سے ان کی ترتیب قائم کی جاتی ہے اور یوں زندہ شخصیت سامنے آتی ہے۔ اچھے خاکہ نگار کا نقطہ نظر ضرور ہمدردانہ ہوتا ہے لیکن وہ حتیٰ الوسع غیر جانبدار ہی رہتا ہے۔"(۱۱)

اس تعریف کے آغاز میں ہی یہ واضح کر دیتے ہیں کہ شخصیت کو ویسا ہی پیش کرنا چاہیے جیسے وہ ہے۔ یعنی خاکہ نہ تو صرف توصیفی مضمون ہوتا ہے اور نہ ہی معائب کا بیان ہوتا ہے۔ یعنی کہ نہ تو وہ قصیدہ ہے اور نہ ہی ہجو۔ خاکہ نگار نے شخصیت کے لیے جن اُوصاف کا مشاہدہ کیا ہوتا ہے اُن کا ذکر ضروری ہے لیکن اُس کے لیے ہمدردانہ رویہ رکھنا خاکہ نگار کی خوبی ہے۔ اِن خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے غیر جانبداری سے کام لینا چاہیے لیکن رویہ ہمدردانہ ہو۔ خاکہ نگار شخصیت کی خامیوں کا تذکرہ اِس طرح نہ کرے کہ اُس شخص سے وحشت ہو بلکہ محبت کا جذبہ برقرار رہے۔ ایک اور اہم واقعے کی طرف یحییٰ امجد اشارہ کرتے ہیں کہ شخصیات کے سارے واقعات نہ لیے جائیں اس کے لیے ایسے اہم واقعات کا انتخاب کیا جائے جس سے شخصیت مکمل طور پر واضح ہو کر سامنے آ جائے۔ اور ان واقعات کے لیے کسی زمانی یا مکانی ترتیب قائم کرنا لازمی نہیں خاکہ نگار کا یہ کمال ہے کہ وہ اپنے فہم کے مطابق اِس کی ترتیب بنائے مگر منطقی ترتیب کا خیال رکھنا لازمی ہے ورنہ خاکہ کا جھکاؤ بے ڈھنگے پن کی طرف ہو جائے گا اور خاکے کا تاثر مجروح ہو جائے گا۔ "آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ" پروفیسر شمیم حنفی کی لکھی ہوئی کتاب ہے جس کے مقدمے میں خاکہ نگاری کی وضاحت اِن الفاظ میں ملتی ہے:

" خاکہ نگاری تاریخ اور تخیل سے یکساں تعلق رکھتی ہے۔ لکھنے والا جب کسی شخصیت کو موضوع بناتا ہے تو واقعات، سوانح، خارجی مشاہدات، کے ساتھ ساتھ اپنے تاثرات اور قیاسات سے بھی مدد لیتا ہے۔ اسی لیے خاکہ ایک جیتی جاگتی، حقیقی شخصیت کی تصویر ہوتے ہوئے بھی افسانے جیسی دل کشی اور دلچسپی کا سامان رکھتا ہے اور پڑھنے والا اسے گویا بیک وقت واقعے کے طور پر بھی پڑھتا ہے اور کہانی کے طور پر بھی۔ چنانچہ ایک کامیاب خاکہ کر جو اس صنف کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو، ہماری فکر اور ہماری احساسات دونوں سے رشتہ قائم کرتا ہے۔ اس صنف کے مطالبات فکری بھی ہوتے ہیں اور تخلیقی بھی۔"(۱۲)

پروفیسر شمیم حنفی کے مطابق خاکہ نگاری میں ایک ہی وقت میں جہاں شخصی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے وہی اِس میں تخیل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ گویا سوانحی ادب ایک ایسی صنف ہے جس میں زمان کے تصور کے ہوتے

ہوئے ایسا منظر تخلیق کیا جاتا ہے جس میں ایک شخصیت کی عملی صورت مشاہدات کی روشنی میں واضح ہو جائے۔ یہ تصویر چلتی پھرتی نظر آتی ہے نہ کہ جامد۔ ایک زندہ شخص کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں جو اس کی پہچان بنتے ہیں۔ اِن پہلوؤں سے وہ شخصیت پہچانی جاتی ہے۔ اِن پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے خاکہ نگار اسے تحریری صورت میں سامنے لاتا ہے اور واقعات کا اندراج کرتا ہے۔

ڈاکٹر غفور شاہ قاسم خاکہ نگاری کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"خاکہ نگاری حُلیہ نگاری بھی ہے، چہرہ نمائی بھی، پیکر تراشی بھی ہے اور کردار نویسی بھی۔ یہ شیشہ سازی کا فن ہے۔۔۔ خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ زبان پر قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ صاحبِ خاکہ کی شخصی گہرائی میں اُتر کر خوبیوں اور خامیوں کے موتی حذف ریز نکال لانے کا ہنر جانتا ہو۔"(۱۳)

اِس تعریف میں ڈاکٹر غفور قاسم نے خاکہ کے چار عناصر کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حُلیہ نگاری، چہرہ نمائی، پیکر تراشی اور کردار نویسی کا مجموعہ خاکہ کہلائے گا۔ اس صنف کے ساتھ تب ہی انصاف کیا جا سکتا ہے جب خاکہ نگار زبان پر قدرت رکھتا ہو وہ اِس لیے کہ دلچسپی خاکہ نگاری کا ایک اہم عُنصر ہے دوسری چیز قوت مشاہدہ کی گہرائی لازمی ہے۔ شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کا مثبت پیرائے میں ذِکر بھی اہم ہے۔ اس تعریف کے ضمن میں یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ حُلیہ نگاری اور چہرہ نمائی دو الگ چیزیں ہیں۔ حُلیہ نگاری میں چہرہ نمائی کی حیثیت ایک جزو کی ہے ۔ شخصیت کا بھرپور تاثر حُلیہ نگاری ہی سے لگایا جا سکتا ہے ۔

بقول ڈاکٹر انور سدید:

"اس (خاکے) میں مشاہدے کے حقیقی گوشے شگفتہ اسلوب میں پیش کیے جاتے ہیں اور کردار کا بامعنی اور مثبت تاثر پیدا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمدردی، مردم شناسی، واقعہ فہمی اور نفسیاتی آگہی اچھے خاکہ نگار کے بنیادی اوصاف شمار ہوتے ہیں۔ خاکے کا مقصد شخصیت کی متوازن عکاسی، تہذیبی حقائق کا انکشاف اور شخصی تاثر کی فنکارانہ پیشکش ہے۔"(۱۴)

خاکے کا اسلوب شگفتگی سے بھرپور ہوتا ہے۔ کردار نگاری میں اِس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ شخصیت مجروح ہو کر ہمارے سامنے نہ آئے بلکہ مثبت تاثر ہونا چاہیے۔ اس تعریف میں ڈاکٹر انور سدید نے تین اہم عناصر کا ذکر کیا۔ جس میں شخصیت کی متوازن عکاسی، تہذیبی حقائق کا انکشاف اور شخصی تاثر شامل ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر خاکے کی وضاحت اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

> "خاکہ کا سوانحی مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہے۔۔۔ خاکہ پنسل سکیچ ہے جس میں کم سے کم لائنوں سے چہرے کا تاثر واضح کر دیا جاتا ہے۔ اب یہ مصور کا اپنا وجدان اور فنی شعور ہے کہ وہ تاثر کو اُبھارنے کے لیے چہرے کے کن خطوط کو نمایاں کرتا ہے۔ شخصیت نگاری اور خاکہ نگاری کو اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ شخصیت نگاری اگر بڑی حویلی ہے تو خاکہ درشن جھروکہ۔"(۱۵)

اس تعریف میں ڈاکٹر سلیم اختر خاکے کو سوانحی مضمون سے الگ قرار دیتے ہیں۔ وہ چہرے کے تاثر کی وضاحت کو اہم قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ چہرے کا تاثر خاکہ نگاری کا ایک عُنصر ہے۔ شاید ڈاکٹر سلیم اختر چہرے سے شخصیت مراد لیتے ہیں۔ چہرے کے تاثر واضح کرنا ایک ایک اہم عُنصر تو ہو سکتا ہے مگر مکمل خاکہ نگاری نہیں۔

مندرجہ بالا تعریفوں سے خاکہ نگاری کے مندرجہ ذیل عناصر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ خاکہ ایک نسبتاً مختصر مضمون ہے جس میں اختصار سے مراد غیر ضروری طوالت سے گریز ہے۔ اختصار خاکے کا عُنصر ہے اور اختصار میں وحدتِ تاثر۔ اگر سوانح عمری ناول ہے تو خاکہ افسانہ۔

کسی شخصیت کو اِس طرح بیان کرنا چاہیے جس طرح وہ ہے۔ اس کو تعریفی یا توصیفی مضمون نہیں بنا دینا چاہیے۔ خاکہ نگار جس طرح شخصیت کا مشاہدہ کرتا ہے بلا کم و کاست ویسے ہی قاری کے سامنے پیش کر دینا چاہیے۔ ضروری ہے کہ خاکہ نگار نہ تو آنکھوں پر عقیدت کی پٹی باندھ لے اور نہ ہی صرف مخالفت میں مبتلا ہو جائے۔ غیر جانبداری مکمل طور پر تو نہیں ہو سکتی مگر خاکہ نگار کی یہی کوشش ہو کہ شخصیت سے وہی تاثر سامنے آئے جس طرح اُس نے مشاہدہ کیا۔

خاکے کا ایک اور اہم عُنصر یہ ہے کہ شخصیت کی متحرک تصویر قاری کے سامنے بیان ہو نہ کہ جامد صورت میں بیان کر دیا جائے کیونکہ یہی چیز اسے سوانح عمری اور سوانحی مضمون سے الگ کرتی ہے۔ اِس کے لیے خاکہ نگار ایسے واقعات کا انتخاب کرے جس سے شخصیت کا تاثر واضح ہو جائے۔ خاکہ نگاری اردو ادب کی ایسی صنف ہے جو

بظاہر بہت سادہ نظر آتی ہے مگر یہ صنف کافی پیچیدہ ہے ۔اِس میں بات کو خاکہ نگار اِس طرح پیش کرتا ہے کہ شخصیت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ قاری کے سامنے آموجود ہوتی ہے۔

شخصیت کا معروضی مطالعہ دراصل خاکہ نگاری ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ خاکہ نگار کی قوت مشاہدہ تیز ہو۔ فہم و ادراک کا سہارا لے۔ خاکہ لکھتے ہوئے غیر جانبداری کا رویہ ہو۔ زبان پر خاکہ نگار قدرت رکھتا ہو۔ اسلوب شگفتگی سے بھرپور ہو۔ شخصیت جیسی ہے اُس کو ویسا ہی پیش کر دیا جائے۔

خاکہ نگاری کسی فرد کی مکمل داستان حیات نہیں اس کے ذریعے کسی فرد کی نمائندہ یا نمایاں خصوصیات سامنے لائی جاتی ہیں۔ اِس کی عادات و اطوار اور احوال و آثار کا علم ہوتا ہے۔خاکے کے فنی لوازم میں مزاح کی چاشنی اور نکتہ آفرینی ضروری عُنصر ہے مگر شخصیت کے مزاج کے اثرات بھی اس پر خوب واضح ہوتے ہیں یعنی جیسی شخصیت ویسے ہی خاکے کا تاثر۔ جس طرح سنجیدہ شخصیت کا خاکہ پُر مزاح نہیں ہو سکتا اِس میں سنجیدگی کا عُنصر شامل ہو گا۔ ویسے ہی سنجیدگی میں شگفتگی، دلچسپی اور تسلسل کے عناصر کا ہونا ضروری ہے۔

ج۔ اردو خاکہ نگاری کی روایت وارتقا:

اردو ادب میں خاکہ نگاری کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی۔ اس کا قطعی طور پر تعین ممکن نہیں۔ ادب کی کوئی بھی صنف یک دم ہی سامنے نہیں آجاتی اُس کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے تب جا کر اس کی شکل و صورت نکھرنے کے بعد اُس کی حیثیت واضح ہوتی ہے اور وہ صنف مقبول ہوتی ہے۔ اس صنف کے اصول و قواعد بنتے ہیں جن میں وقت کے ساتھ پختگی آتی ہے پھر ایک طویل عرصے کے بعد وہ ایسی شکل اختیار کر لیتی ہے کہ اس کی تعریف اور وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ اس صنف کا نام ہی ایک حوالہ بن جاتا ہے۔ یہ مراحل ہر صنف کے لیے مختلف ہوتے ہیں۔ اِس کا انحصار اس پر ہے کہ لوگ اس میں کس قدر دلچسپی لیتے ہیں؟ اس کی مقبولیت اور رجحان کی شرح کیا ہے؟ اہلِ فن کو اس صنف کے اصول وضوابط کے تعین کی ضرورت محسوس کیوں ہوئی ہے؟

اردو خاکہ نگاری کی روایت قدیم تذکروں میں نظر آتی ہے۔ پرانے تذکرہ لکھنے والے شعراء کے بارے میں جن سطروں کو تحریر کرتے تھے۔ اُنھیں سطروں میں بعض اوقات شعراء کا حلیہ، افکار، مزاج اور معاشرے میں اُن کے مقام کے بارے میں اکثر اظہارِ خیال کر دیتے تھے۔ اٹھارویں صدی کے درمیان میں جن تذکرہ نگاروں نے اردو شعرا کے بارے میں لکھا۔ اُن کی شاعری کو موضوعِ بحث بنانے کے ساتھ قاری کے سامنے شخصیت کا دھندلا عکس بھی پیش کرنے لگے۔ "نکات الشعراء" میر کی تصنیف ہے جس میں ایسے نقوش جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ اِس

کے علاوہ باقی تذکروں میں بھی ایسے نقوش تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ میر نے چند فقروں میں بڑے اختصار کے ساتھ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ کر دیا ہے مثلاً میر عبد الحیٔ کے بارے میں میر لکھتے ہیں کہ:

"نوجوان بامزۃ بود۔ سعید نجیب الطرفین، مولد اور شاہجان آباد ست،بسیار خوش فکر و خوبصورت، خوش خلق، پاکیزہ سیرت، معشوق عاشق مزاج۔ تاحال در فرقہ شعراء او شاعر خوش طاہر از مسکن بطون عدم بعرضہ ظہور جلوہ گر نشدہ بود زبان و نکینشاہ کیزہ تراز برگ گل، گلستان سخن دانازک دماغ بلبل۔"(۱۶)

میر عبد الحی کا تفصیلی ذکر میر کے ہاں نظر آیا ہے جس میں اُنھوں نے خاکہ نگاری کی جھلک دکھائی ہے۔ یہ تذکرہ فارسی میں ہے مگر اردو شعرا کا ذکر کیا جارہا ہے تو اِس حوالے سے اس کا نام لیا جاتا ہے۔ لٰہذا درج بالا اقتباس دیا گیا ہے۔ تذکرے میں میر نے خاکے کے اور نقوش بھی دکھائے ہیں۔ مگر یہ عناصر یا نقوش کی حد تک ہے اِس کو مکمل خاکہ نہیں کہہ سکتے۔

تذکروں کے علاوہ خطوط میں بھی ایسے نقوش تلاش کیا جا سکتے ہیں۔ غالب کے خطوط میں اِس طرح کی سطریں نظر آتی ہیں جن پر خاکہ نگاری کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر اس کو مکمل خاکہ نہیں کہہ سکتے بہر حال اس کے ابتدائی دور میں اِس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ذیل میں غالب کے خطوط میں سے ایک مثال درج کی جاتی ہے۔

"یوسف علی خان شریف و عالی خاندان ہیں۔ بادشاہ دہلی کی سرکار سے تیس روپے مہینا پاتے ہیں۔ جہاں سلطنت گئی وہاں وہ تنخواہ بھی گئی۔ شاعر ہیں۔ ریختہ کہتے ہیں۔ ہوس پیشہ ہیں۔ مضطر ہیں، ہر مدعا کے حصول کو آسان سمجھتے ہیں۔ علم اس قدر ہے کہ لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ اُن کا باپ میرا دوست تھا۔"(۱۷)

اس اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اردو خاکہ نگاری کے اولین نقوش کہیں نثری تحریروں میں ملتے ہیں ان یہ نقوش کہیں کم اور کہیں زیادہ ہیں۔ غالب کی اس خط سے یوسف علی خان کے بارے میں معلومات ملتی ہے۔ درج بالا اقتباس یا خط کو خاکہ تو نہیں کہہ سکتے مگر اولین نقوش میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی تذکروں میں بھی موجود شاعر کے شخصی اوصاف کو مکمل خاکہ تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس میں شخصیت کے اظہار کی بجائے شاعر کے کلام کو بنیادی اہمیت دی جاتی تھی۔ شاعر کے شخصی اوصاف کو اُبھارنے کے لیے چند تعارفی جملے دیے جاتے تھے یا کوئی اہم واقعہ بیان کر دیا جاتا تھا جس میں وحدتِ تاثر کا عُنصر کم ہی ملتا ہے۔ جس سے پوری شخصیت اُبھر کر سامنے نہیں آتی تھی۔

محمد حسین آزاد کی کتاب "آبِ حیات" کی یہ خوبی ہے کہ اردو تذکرے، اردو تنقید، ادبی تاریخ نویسی منفرد کے منفرد اور نمایاں عناصر اِس کتاب میں نظر آتے ہیں بلکہ اِن کو نقطہ آغاز کہہ سکتے ہیں۔ اِس سے محمد حسین آزاد کی ہمہ گیری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ محمد حسین آزاد کی کتاب "آبِ حیات" کو خاکہ نگاری کی روایت میں اہم دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اس کتاب میں خاکہ نگاری کی شعوری کوشش دیکھی جاسکتی ہے۔ اِس کو مکمل خاکہ تو نہیں کہہ سکتے مگر محمد حسین آزاد نے کلام کے ساتھ شخصیت کی قلمی تصویر پیش کرنے کی شعوری کوشش کی ہے جس کا ذکر محمد حسین آزاد نے کیا ہے۔ "آب حیات" میں محمد حسین آزاد نے شعراءادبا کے جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے مرقعے خوبصورتی سے پیش کیے ہیں۔ محمد حسین آزاد "آبِ حیات" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

”جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرقِ مذکورہ ہیں انھیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، چلتی پھرتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انھیں حیات جاوداں حاصل ہو۔“(۱۸)

میر، انشاء، مصحفی اور ذوق کے شخصی مرقعوں میں خاکہ نگاری کے واضح اور نسبتاً زیادہ عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔ بالخصوص ذوق پر لکھا ہوا مضمون خاکے کے بہت قریب ہے۔ جس میں موجود درج ذیل اقتباس دیکھنے کے لائق ہے۔

”اگرچہ ان کی طبیعت حاضر رسا، فکر رسا، بندش چست اس پر کلام میں زور سب کچھ تھا۔ مگر چونکہ یہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے، نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا۔ اس لیے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔“(۱۹)

تذکروں کے علاوہ سوانح کی کتابوں میں بھی خاکے کے نمونے مل جاتے ہیں۔ اِن تحریروں کو اگر مکمل تسلیم نہ بھی کیا جائے تو ان میں ابتدائی کوشش یا جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے یادگارِ غالب وغیرہ کو فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ایک اچھی سوانح میں انسانی عادات وخصائل، شخصی اوصاف، معائب ومحاسن کو فنی طور پر اِس مہارت سے بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخصیت قاری کے سامنے آجائے اور ظاہر ہے ایسی کوشش کو خاکہ نگاری کا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

آپ بیتیوں میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ اپنا تذکرہ بیان کرنے والا شخص اپنی یادداشتیں لکھتا ہے اور اِن یاداشتوں میں اِس کے تعلقات بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ آپ بیتی لکھنے والا شخص اپنی شخصیت کے تناظر میں ان شخصیات کی نقاب کشائی بھی کرتا ہے جو اس کے تعلق دار ہیں۔ بقول پروفیسر شمیم حنفی:

"ہر معقول آپ بیتی اپنے علاوہ دوسروں کی سرگزشت کا بیان ہوتی ہے۔ لکھنے والا دوسروں کے واسطے سے بھی اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو سب سے زیادہ ظاہر دوسروں کے تذکرے میں کرتے ہیں۔ ایسی آپ بیتیاں جو دوسروں کے ذکر سے یہ یکسر خالی ہوں، ناقابلِ برداشت حد تک تھکا دینے والی ہوتی ہیں۔"(۲۰)

یہ ممکن ہی نہیں کہ اپ بیتی کسی دوسرے شخص کے عمومی یا خصوصی تذکرے سے بالکل خالی ہو۔ اس میں مختلف شخصیات کے ساتھ تعلقات کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس اظہار میں دوسری شخصیت کے حوالے سے دلچسپ عناصر بھی لکھ دیے جاتے ہیں جو خاکوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ درج بالا بحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادبی تذکروں، ادبی تاریخ نویسی، خطوط، سوانح عمریوں اور آپ بیتوں میں خاکے کے ابتدائی نقوش کئی کم اور کئی زیادہ نظر آتے ہیں۔ یہ مکمل خاکے تو نہیں ہیں اِن سے خاکوں کے عناصر ضرور ملتے ہیں۔ لہٰذا خاکہ نگاری کی روایت میں اِن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ کسی بھی صنف کی روایت میں ان تمام نمونوں کو اہمیت دی جاتی ہے جہاں سے گزر کر وہ صنف دورِ جدید تک پہنچتی ہے۔

گزشتہ بحث اس بات پر تھی کہ خاکہ نگاری کو بطور صنف قبول کرنے سے قبل دیگر ادبی اصناف اور نثری نمونوں میں خاکے کے نشانات ملتے ہیں۔ اب ہم مختصراً اُن ادباء کی ان ادبی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہیں جنھوں نے بطور صنف خاکہ نگاری کو برتا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کو اردو خاکہ نگاری کی روایت میں پہلا خاکہ نگار مانا جاتا ہے۔ ان کی کتاب "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" کے عنوان سے منظرِ عام پر آئی۔ اسے پہلا با قاعدہ خاکہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے پاس اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کے حوالے سے بہت سے واقعات اور وسیع معلومات موجود تھی اُنھوں نے اس میں سے چند واقعات کا انتخاب کر کے ایسا مخصوص انداز اختیار کیا ہے کہ جس کی بنا پر یہ پہلا خاکہ قرار دیا جاتا ہے۔ اِس خاکے میں کسی مخصوص تکنیک کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا۔ اس خاکے میں ڈپٹی نذیر احمد کی عادات، مکان کے نقشے کے حوالے سے معلومات ملتی ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی ایک اور اہم کتاب کا نام "دلی کا ایک یادگار مشاعرہ" ہے۔ اِس میں ایک مشاعرے کا ذکر ہے جس میں افراد پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ آپ کے خاکوں میں مکان کی تفصیل، رہن سہن کی تفصیل اور شخصیت کی ہیئت کذائی نسبتاً زیادہ ہے۔ عادات و خصائل، نشست و برخاست کے حوالے سے ان کے ہاں خارجیت کا عُنصر زیادہ ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد ادباء کی ایک اچھی خاصی تعداد خاکہ نگاری کی طرف متوجہ نظر آتی ہے۔ اِن ممتاز لکھنے والوں میں آغا حیدر حسن دہلوی، مولوی عبدالحق، محمد شفیع دہلوی، خواجہ غلام السیدین، عبدالماجد دریا آبادی اور رشید احمد صدیقی کے نام قابل ذکر ہیں۔

خاکہ نگاری کے حوالے سے ایک اہم نام رشید احمد صدیقی کا بھی آتا ہے۔ آپ کی کتاب "گنج ہائے گراں مایہ" کو اردو خاکہ نگاری کی روایت میں اہم سنگِ میل کی حیثیت رہی ہے۔ "گنج ہائے گراں مایہ" کے علاوہ رشید احمد صدیقی کی کتابوں میں ذاکر صاحب اور ہم نفسانِ رفتہ ہیں۔ "گنج ہائے گراں مایہ" میں تیرہ شخصیات کے خاکے شامل ہیں جن کے ساتھ رشید احمد صدیقی کے روابط رہے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے بعد ڈاکٹر مولوی عبد الحق کی کتاب "چند ہم عصر" کو بھی خاکہ نگاری کی روایت میں اہمیت دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں معروف لوگوں کے ساتھ ساتھ غیر معروف لوگوں کے بارے میں اُن کی زندگی اور کارناموں پر لکھا ہے۔ اِس میں سوانح کا رنگ غالب ہے۔ عصمت چغتائی نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر "دوزخی" خاکہ لکھا ہے۔ اِس خاکے کو اردو ادب کا بہترین خاکہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ خاکے اور افسانے کے بین بین ہے۔ اس کی تکنیک افسانے کی سی ہے۔ "گنجے فرشتے" کے عُنوان سے سعادت حسن منٹو کی کتاب جون ۱۹۵۲ء کو منظرِ عام پر آئی۔ منٹو نے اِس میں ایک الگ راہ نکالی ہے اس۔ خاکے پر افسانوی رنگ غالب ہے جس وجہ سے اس میں دلچسپی نظر آتی ہے۔ مصنف کے لکھنے کا آغاز منفرد ہے۔ لہٰذا خاکہ نگاری کی روایت میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ ۱۹۵۵ء میں سعادت حسن منٹو کی دوسری کتاب لاؤڈ سپیکر سامنے آئی۔ اِس کتاب میں اُسی تکنیک کو برتا گیا ہے جو "گنجے فرشتے" میں ہے۔ البتہ اس میں افسانوی مزاج نسبتاً کم ہے۔

خاکہ نگاری کی روایت میں شاہد احمد دہلوی کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ آپ کی کتاب "گنجینہ گوہر" خاکہ نگاری کی روایت میں کافی اہم ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۲ء کو سامنے آئی۔ اس کتاب میں 17 خاکے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کا اسلوب باقی خاکہ نگاروں سے منفرد ہے۔ کم الفاظ کے ذریعے جزئیات بیان کر دینے پر قدرت رکھتے ہیں۔ محمد طفیل کا نام بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کی کتاب فروری ۱۹۶۱ء کو سامنے آئی۔ اِس کتاب میں پانچ مکمل خاکے جبکہ ۱۷ مختصر شخصی مضامین شامل ہیں۔ آپ کا اسلوب مزاحیہ ہے۔ اِس کے علاوہ بھی بہت سے خاکے اور خاکہ نگار سامنے آئے ہیں۔ لہٰذا خاکہ نگاری کی روایت ایک طویل مقالے کی متقاضی ہے۔ یہاں پر سرسری اُن کا ذِکر کرتے ہیں۔ جنہوں نے خاکہ نگاری کی روایت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُن کے نام درج ذیل ہیں:

مجتبیٰ حسین، اشرف صبوحی، شوکت تھانوی، چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر خورشید رضوی، مشتاق احمد یوسفی، عطاالحق قاسمی، سید ضمیر جعفری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، مرزا ادیب، اسلم فرخی، رئیس احمد جعفری، فکر تونسوی، اعجاز حسین، دیوان سنگھ مفتون، رحیم گُل، فارغ بخاری، اے حمید، یونس جاوید، امرؤ طارق، انور سدید، ابو الخیر کشفی، شورش کاشمیری، عبد الاحد خان، تخلص بھوپالی، ضیا الدین احمد برنی، علی جواد زیدی، مالک رام، احمد عقیل روبی، عبد المجید سالک، معین الدین درانی قابلِ ذکر ہیں۔ دورِ حاضر کے خاکہ نگاروں میں نصر اللہ خاں "کیا قافلہ جاتا ہے"، عبد

المجید سالک "یارانِ کہن"، ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی "میں اور میرے خاکے"، ڈاکٹر اے بی اشرف "کیسے کیسے لوگ"، مظہر احمد شیرانی "بے نشانوں کا نشاں"، شمیم حنفی "ہم نفسوں کی بزم میں" کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

د۔ جہانِ دِگر کا تعارف:

"جہانِ دِگر" احسان دانش کی تصنیف ہے۔ جس میں اُنھوں نے مختلف شخصیات کے تذکرے لکھے ہیں۔ اس کتاب کو آپ کی وفات کے بعد خزینہ علم وادب لاہور نے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب ۱۷۸ء صفحات پر مشتمل ہے۔ "جہانِ دِگر" کے بارے میں احسان دانش "جہانِ دانش" کے اختتام پر لکھتے ہیں:

> "میں اپنی اس کتاب "جہانِ دانش" کی پہلی جلد یہیں تک رکھتا ہوں! دوسری جلد میں حالات وواقعات کے ساتھ اُن لوگوں کا ذکر کروں گا جن سے میں کبھی اور کسی بھی رُخ سے متاثر ہُوا ہوں، اُن میں بلا امتیاز مذہب و ملت، شاعر، ادیب، تاجر، طبیب، حکام، قائد، مصور، عالم، نقاد، معلّم، پیر زدگان اور وُہ فنکار بھی شامل ہوں گے جو مجھے کسی بھی فن میں باکمال نظر آئے ہیں۔"(۲۱)

درج بالا اقتباس میں احسان دانش نے "جہان دِگر" کا نام تو نہیں لیا لیکن یہ واضح ہوتا ہے کہ اُن کا اشارہ "جہان دِگر" کی طرف ہی تھا۔ "جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے اُن شخصیات کا ذِکر کیا ہے جن سے وہ متاثر ہوئے یا اُن کے ساتھ اُن کا قلبی تعلق رہا۔ "جہانِ دِگر" کے آغاز میں احسان دانش نے جہانِ دانش کی طرح اپنے مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر یہاں اُن کا انداز شاعرانہ ہے۔

> "میرے لڑکپن نے چلچاتی ہوئی دھوپ اور موسلا دھار بارشوں میں بھاگ دوڑ کر جوانی کا دامن تھاما تھا کہ شاید اب بھی وقت کو رحم آجائے لیکن جوانی نے بھی سوتیلوں جیسا سلوک روا رکھا اور میں سر جھکائے اس ماہ و سال کے سیلاب میں ڈوبتا اُبھرتا مصروفِ سفر رہا ۔۔۔۔ میں اپنے چاروں طرف کانس کے جھنڈ محسوس کرتا تھا جہاں ذراسی ہوا کی رمق چونکا تو دیتی ہے لیکن سرکنڈوں کی پھلن کے سوا کوئی شگفتہ شے نظر نہیں آتی۔"(۲۲)

زندگی کے بارے میں احسان دانش لکھتے ہیں:

> "میری نظر میں زندگی رہگزار عدم سے اٹھا ہوا ایک بگولا ہے جو جنگلوں، شہروں، دریاؤں، ساحلوں اور خلاؤں میں چکرا چکرا کے ختم ہو جاتا ہے مگر اس میں بعض بعض مقامات ایسے آتے ہیں کہ گوری گوری تالیوں کی سنہری آوازیں دل کو لبھاتی اور چشم و گوش کے لیے ایک حسین تماشا بن جاتی ہیں۔"(۲۳)

احسان دانش "جہانِ دِگر" کے آغاز میں اپنے متعلق چند باتیں کرتے ہیں اُس کے بعد پاکستان کے اُس وقت کے معاشرے پر تبصرہ کرتے ہیں اور اسی ضمن میں تقسیم کی وجہ سے بچھڑنے والے اپنے دوستوں کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔اس گفتگو کے لیے اُنھوں نے کچھ عنوان قائم کیے ہیں۔ مثلاً علماء کرام، نقوش رفتگاں، پولس، چاندنی کے سائے، صحافت پر لمحہ فکریہ، شاعرات، میرے خود ساز ساتھی ۔احسان دانش نے ان عنوانات کے تحت اُن تمام لوگوں کے نام درج کیے ہیں اُس کے بعد بالترتیب تذکرہ پیش کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ "اساتذہ پنجاب یونیورسٹی اور دیگر معلمین" کے عُنوان کے تحت احسان دانش نے پنجاب یونیورسٹی کی مختصر تاریخ اور اُن کا سفر بھی بیان کیا ہے ۔دراصل "جہانِ دِگر" میں دوسری شخصیات کا تذکرہ شامل ہے اور احسان دانش نے اس میں اپنے حوالے سے کافی کم باتیں کی ہیں۔ آغاز میں ہی احسان دانش اس طرف اشارہ کر رہے ہیں اور اس بارے میں لکھتے ہیں:"میں نے حروفِ تہجی کے اعتبار سے اپنے اردگرد کے لوگوں کا ایک تذکرہ لکھا ہے جس کا کہیں کہیں سے انتخاب اس کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔"(۲۴)

درج بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب تذکرے کی ہے۔اور اس تذکرے میں معروف اور غیر معروف دونوں طرز کے لوگ شامل ہیں۔احسان دانش کے اس تذکرے میں کچھ ایسی معلومات بھی ملتی ہے جو صیغہ راز میں تھی۔ مثلاً ناصر کاظمی کو کبوتر پالنے کا بڑا شوق تھا اِس کے علاوہ مسیح الحسن بقا نقوی جو حلقہ اربابِ ذوق سے وابستہ تھے اُن کی حالت زار اور ناقدری کا علم بھی اِسی کتاب سے ہوتا ہے۔احسان دانش کہ یہ کتاب مختلف انسانوں کی ایک البم ہے جس میں ہر طرز کے انسانوں کی تصویریں لگی ہیں جہاں مختلف لوگ آتے ہیں اور اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔اِن میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو بظاہر تو دوست ہیں مگر احسان دانش کی قابلیت سے خائف بھی نظر آتے ہیں۔کچھ مخلص دوست بھی ہیں جو پوری توانائی سے آپ کی مدد کے لیے تیار ہیں۔اِس میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو راہ چلتے متاثر کرتے ہیں عبرت دیتے ہیں حوصلہ دیتے ہیں نہ ملنے کے لیے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ مختصراً "جہانِ دِگر" مختلف انسانوں کی البم ہے۔ اور ایک شاعر کی زندگی کو سمجھنے کے لحاظ سے "جہانِ دِگر" بے حد اہم اور مفید ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسین، خاکہ نگاری، مشمولہ: نگار کراچی، جون ۱۹۵۹ء صفحہ ۴۲

۲۔ محمد عمر رضا، ڈاکٹر، اردو میں سوانحی ادب فن اور روایت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۳۲

۳۔ امجد کندیانی، بحوالہ محمد علیم الدین، رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۸

۴۔ ساجد صدیق نظامی، مدثر جمیل، تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند جلد ششم، مشمولہ: " خاکہ نگاری"، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، اگست ۲۰۱۴ء ص ۱۷۸

۵۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، خاکہ نگاری فن اور تنقید، شاخسار پبلشرز، راولپنڈی، اشاعت اول، ۱۹۹۰ء، ص ۱۰

۶۔ وہاب عندلیب، قامت و قیمت، اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرا باد، ۱۹۸۱ء، ص ۱۱

۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات توضیحی لغت، سنگِ میل، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۱۷

۸۔ صابرہ سعید، ڈاکٹر، اردو ادب میں خاکہ نگاری، پہلا ایڈیشن، حیدر آباد، ۱۹۷۸ء، ص ۱۳۰

۹۔ عائشہ طلعت خلجی، ء اردو میں خاکہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ " غیر مطبوعہ مقالہ، یونیورسٹی آف دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۰۹

۱۰۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام اباد، ۲۰۱۴ء ص ۹۸، ۹۷

۱۱۔ یحییٰ امجد "اردو میں خاکہ نگاری" مشمولہ: اردو نثر کا فنی ارتقاء، مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۴ء، ص ۳۶۵

۱۲۔ شمیم حنفی، پروفیسر، مقدمہ، اردو خاکہ، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۰۹

۱۳۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، تدبیر حرف، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۳۱۳

۱۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، اے ایچ پبلشرز، لاہور، طبع اول، اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۵۸۹

۱۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۵۳۳

۱۶۔ میر تقی میر، نکات الشعراء، انجمن ترقی اردو اورنگ اباد، دکن، ۱۹۳۵ء، ص ۴۴۳

۱۷۔ مرزا غالب، اردوئے معلٰی، جلد اول، ظفر سنز پرنٹرز، لاہور، ۱۹۶۹ء ص ۱۱۷

۱۸۔ محمد حسین آزاد، آبِ حیات، عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ، ۱۹۶۷ء، ص ۱۱

۱۹۔ محمد حسین آزاد، آبِ حیات، اُترپردیش، اُردو اکادمی، لکھنو چھٹا ایڈیشن، ۲۰۰۳ء، ص ۴۲۳

۲۰۔ شمیم حنفی، پروفیسر، آزادی کے بعد دہلی میں اردو، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴

۲۱۔ احسان دانش، جہانِ دانش، خزینہ علم وادب، الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور، ص ٦۴٦
۲۲۔احسان دانش، جہانِ دِگر، خزینہ علم وادب، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور ۲۰۰۱ء، ص ۳۳
۲۳۔ ایضاً، ص ۳
۲۴۔ ایضاً، ص ۴

باب دوم:

"جہانِ دِگر" میں حلیہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ

الف۔ باطنی خدوخال:

کسی بھی شخصیت کو سمجھنے اور جاننے کے لیے یہ کافی اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ اور یہ خاکہ نگاری کے ایک اہم عنصر کے زمرے میں بھی آتا ہے۔ باطنی خدوخال سے ہی کسی شخص کو حقیقی طور پر پہچانا جاسکتا ہے۔ جس طرح خاکہ نگار کے ہاں خاکہ لکھنے کے اور دیگر مقاصد ہوسکتے ہیں وہاں پر باطنی خدوخال کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ کیونکہ اردو کے تقریباً جتنے بھی خاکہ نگار ہیں ان کے ہاں اس فن کو دیکھا جاسکتا ہے۔ باطنی خدوخال سنجیدہ فن ہونے کے ساتھ ساتھ مشکل بھی ہے۔ باطنی خدوخال کے ذریعے سے ہی صاحب خاکہ کی مکمل تصویر قاری کے سامنے واضح ہو سکتی ہے۔ چونکہ خاکہ نگار کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ جس پر خاکہ لکھ رہاہے اس کی تصویر قاری کے سامنے پیش کرے اُس کے لیے خاکہ نگار اس عناصر کا استعمال کرتا ہے۔ عاشق ہرگانوی اس بارے میں بیان کرتے ہیں کہ:

> "خاکہ نگاری میں شخصیتوں کی تصویریں اس طرح براہِ راست کھینچی جاتی ہیں کہ ان کے ظاہر و باطن دونوں قاری کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پڑھنے والے نے نہ صرف قلمی چہرہ دیکھا بلکہ خود شخصیت کو دیکھا بھالا اور سمجھا بوجھا ہو۔ اس لیے قلمی تصویر اور مرقع سے بھی موسوم کی جاتی ہے۔"(۱)

درج بالا تعریف سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن پر بھی توجہ دی جاتی ہے اور ہمارے خاکہ نگاروں نے اس پر خصوصی توجہ دی ہے تاکہ قاری کے سامنے صاحب خاکہ کی تصویر مکمل طور پر سامنے آجائے۔ اور قاری کو ایسا محسوس ہونا چاہیے کہ وہ صاحبِ خاکہ کو صحیح طور پر دیکھ اور سمجھ رہاہے۔ اور اُسے صاحبِ خاکہ کے معائب و محاسن سے آگاہی حاصل ہے۔ باطنی خدوخال کے حوالے سے محمد علیم الدین اپنے مقالے "رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری کا تنقیدی جائزہ" میں یوں رقمطراز ہیں۔

> "خاکہ ایک نثری صنف ہے۔ جس میں اختصار کے ساتھ کسی شخصیت کے نمایاں، اہم اور امتیازی پہلوؤں کی خواہ وہ اچھے ہوں یا برے، دلچسپ اور لطیف پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے۔ جس سے قاری مختصر اور اجمالی طور پر ہی سہی، اس مخصوص شخصیت کے ظاہری اور باطنی خدوخال سے واقف بھی ہو جاتا ہے اور اسے بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے۔"(۲)

درج بالا تعریف کے ذریعے ایک بات تو یہ واضح ہوتی ہے کہ اختصار بھی خاکے کا اہم عنصر ہے۔ مزید یہ کہ شخصیت کے اہم پہلوؤں کو اجمالی انداز میں بیان کر دینے کا نام خاکہ نگاری ہے۔ مگر یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ خاکے میں ظاہر کے ساتھ ساتھ باطنی خدوخال سے بھی واقفیت ہوتی ہے جس سے فہم بھی حاصل ہوتا ہے۔ محمد طفیل کی بات سے اس عناصر کو سمجھنے میں مزید آسانی ہو گی۔

محمد طفیل کی اس تعریف سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خاکے میں ظاہری احوال و آثار کے ساتھ باطنی خدوخال کو بھی ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ "جہانِ دِگر" از احسان دانش میں باطنی خدوخال جو کہ خاکے کا اہم عُنصر ہے نظر آتا ہے۔ بیداری احساس کے عُنوان سے احسان دانش نے جو عنوان "جہانِ دِگر" میں قلمبند کیا ہے اس میں وہ یوں رقمطراز ہیں۔

> "میں جب بھی ادیبوں اور شاعروں کی سوسائٹی میں جاتا تو بڑی حیرت میں ڈوبا ہوا واپس آتا اور یہ سوچتا کہ یہ حساس اور اسرار تاریخ سے واقف مخلوق صرف خدوخال اور حسن و عشق کے دائرے سے باہر کیوں نہیں نکلتی اگر ادب معاشرت، اجتماعیت اور ماحول کا ترجمان ہے تو یہ ادیب اور شاعر کس معاشرے کے انسان ہیں کہ ان کی تحریروں میں جنسیات کے علاوہ کوئی جذبہ زندہ نظر نہیں آتا ان کے ادب میں قوم، ملک، مذہب اور اخلاق کے لیے جگہ نہیں نکلتی، انہیں تو معاشرے اور گرد و پیش کا سچا آزاد اور وقیع ترجمان ہونا چاہیے ان کے سینوں میں تو نازک ترین جذبات کی لہریں اور پاکیزہ ترین خیالات کا جوار بھاٹا ہونا چاہیے۔ مگر یہ تو عموماً جنس کے رسیانشوں کے عادی اور دروغ بانی کے دلدادہ ہیں۔ ان میں تو کوئی بین الاقوامی اقدار سے آگاہ اور بین الانسانی اخلاق کا حامل نہیں ہے۔"(۳)

درج بالا باتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ احسان دانش کو انسانی نفسیات پر عبور حاصل ہے۔ اور وہ معاشرے کے اندر جو کچھ دیکھتے ہیں۔ اس کو من و عن بیان کر دیتے ہیں۔ وہ بات کو ملفوف انداز میں بیان نہیں کرتے۔ احسان دانش چونکہ خود بھی حساس شاعر ہیں اور اسی معاشرے کا حصے ہیں۔ اور ایک شاعر دوسرے شاعر کے جذبات و احساسات سے بخوبی واقف ہوتا ہے لہذا وہ شاعروں کی سوسائٹی میں رہ کر ان کی جو نفسیات ہوتی ہیں اس کے بارے میں سوچتے ہیں کہ بالاخر یہ شاعر حضرات حسن و عشق کے دائرے سے کیوں نکل نہیں پاتے انہیں تو معاشرے کی ہر کڑی پر بات کرنا ہوتی ہے۔ اُن کے سینوں میں حساس جذبہ ہونا چاہیے۔ مگر اُنھوں نے کیوں جھوٹ کو اپنار کھا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو شاعر اور ادیب کے ہاں معاشرے کی تھوڑی بہت ترجمانی موجود ہو تو اسے صحیح مقام نہیں دیا جاتا۔

احسان دانش "جہان دگر" میں مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ آپ معروف محدث ، فقیہ اور عالم دین تھے ۔بے شمار تصنیفات بھی آپ نے تالیف کی ہیں یہ تصنیفات مختلف علوم و فنون پر مبنی ہیں ان کے اس تذکرے میں احسان دانش باطنی خدوخال کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔

"آپ تفسیری مسائل اور مسائل حدیث کے بعض رموز و غوامض میں حضرت نانا توی ہی سے رجوع کرتے تھے، روحانی تشنگی حضرت حاجی امداد اللہ مکی کے چشمے سے دور کی حقیقت یہ ہے کہ حکیم الامت کا لقب آپ ہی کی ذات بابرکت کو زیب دیتا ہے، آپ کی تبلیغ و تلقین اور تصنیفات وتالیفات سے ہزاروں بندگانِ خدا کو نیکی کا راستہ ملا اور باطل میں اجالے ہوئے۔"(۴)

مذکورہ پیراگراف میں اسلامی خاکہ نگاری کا طرز پایا جاتا ہے۔ مصنف نے مولانا اشرف علی تھانوی کا تذکرہ بیان کیا ہے جس میں خاکے کا عنصر باطنی خدوخال ملتا ہے۔ ایک طرف تو مصنف نے قاری تک یہ معلومات بہم پہنچائی ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی جو خود اپنے زمانے کی معروف شخصیت مگر جب کوئی تفسیری مسئلہ یا حدیث کے مسئلے کے رموز کے لیے حضرت نانوتوی سے رجوع کرتے تھے۔ دوسری طرف یہ معلومات بھی ملتی ہے کہ آپ نے اپنی روح کی پیاس حضرت حاجی امداد اللہ مکی کے چشمے سے دور کی ۔ مصنف کا ماننا ہے کہ حکیم الامت کا لقب آپ ہی کے سر سجتا ہے۔ مذکورہ پیراگراف کو مد نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ایک ہی پیراگراف میں ایک طرف اسلامی خاکہ نگاری کا طرز موجود ہے تو دوسری طرف معلوماتی خاکے کا رنگ بھی ملتا ہے۔ احسان دانش مزید لکھتے ہیں کہ ان کی تالیفات ہی کی وجہ سے ہزاروں بندگانِ خدا کو بھی نیکی کا راستہ ملا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جو آپ کے ساتھ جوڑا یا آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوا اس کے باطن میں روشنی ہو گئی۔ "جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے مولینا مفتی محمد شفیع کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے علماء میں سے ہیں۔ اپنی وسیع معلومات کی وجہ سے عوام وخواص میں معروف ہیں۔ احسان دانش مولینا مفتی محمد شفیع کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

"حضرت شیخ الہند کی اسارت مالٹا سے رہائی کے بعد مفتی محمد شفیع صاحب حضرت شیخ الہند سے بیعت ہوئے اور حضرت کے وصال کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی سے رجوع کیا اور بہت کم عرصے میں ان سے بھی خلافت حاصل کر لی اور تعلیم ظاہری کے ساتھ تعلیم باطنی میں مشغول ہو گئے۔"(۵)

درج بالا اقتباس میں حضرت شیخ الہند کی ریائی اور حضرت شیخ الہند سے بیعت کا تذکرہ ہوا ہے پھر حضرت کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی سے رجوع کرتے ہیں اور بہت معقول عرصے میں ان

سے بھی خلافت حاصل کر لیتے ہیں جس میں تعلیمی ظاہری کے ساتھ باطنی تعلیم میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ "جہانِ دِگر" میں مولٰینا مفتی محمد محمود صاحب کا جو تذکرہ بیان کیا گیا ہے اُس میں بھی باطنی خدوخال کا عُنصر نظر آتا ہے۔ آپ کی تقریروں میں بیش قیمت معلومات ملتی ہے۔ اور معاشرے میں آپ کو اعتماد کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے شاگرد بھی شیریں زبان اور آپ کے مداح ہیں۔ ایسی خصوصیات کسی اور معلم کے حصے میں نہیں آتی۔ مصنف مولانا مفتی محمد محمود صاحب کے باطنی خدوخال کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

"موصوف بھی فاضل دیوبند ہیں اور صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں لیکن ان کی وزارت کو ان کی علمی بلندی استعداد کے سامنے پرکاہ کے برابر بھی خیال نہیں کرتا، ان کے علمی اقتدار کے سامنے تو تاج شاہی بھی جھلکار نہیں دیتا مگر اس اقتدار کو بھی علمی حلقے ہی جانتے ہیں، ان کے باطن میں فقہی اور قرآنی سرمائے کے ساتھ موجودہ دور کی معلومات کا ذخیرہ قابلِ رشک ہے۔"(٦)

مذکورہ پیراگراف میں مولانا مفتی محمد محمود صاحب کا تذکرہ بیان کیا گیا ہے۔ آپ بطور فاضل دیوبند اور صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بھی رہ چکے ہیں۔ آپ کی علمی بلندی کی وجہ سے مصنف اپنے آپ کو اُن کے سامنے حقیر سمجھتے ہیں۔ مصنف مزید بیان کرتے ہیں کہ آپ کے باطن میں فقہی اور قرآنی سرمایہ تھا۔ اس کے علاوٗہ آپ کے ہاں موجودہ دور کی معلومات کا ذخیرہ بھی ملتا ہے جو قابلِ رشک ہے۔ احسان دانش نے مولانا محمد زکریا کاندھلوی کا بھی تذکرہ کیا ہے آپ قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ مولانا صاحب تبلیغی جماعت کے نمائندہ عالم بھی تھے اس کے علاوہ انہوں نے اپنی سوانح "یادِ ایام" بھی تحریر کی ہے مصنف آپ کے باطنی خدوخال کا تذکرہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"مولانا زکریا کاندھلوی کی تحریروں میں ایسا سلجھاو ہے کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی مستفید ہو سکتا ہے اور یہی تحریر کی خوبی ہے، یہ خوبی صرف تحریر میں نہیں تقریر میں بھی کامیاب رہتی ہے اور مقرر اپنے دل کی آگ کو عوام کے سینوں میں انڈیل دیتا ہے۔ علمی گفتگو اور مغلق الفاظ تبلیغ دین کے سلسلے میں کند ہتھیار قرار پاتے ہیں۔ مولانا زکریا کا طرز تحریر قابلِ تقلید ہے۔۔۔ صاحب باطنی اور علم کے ساتھ عمل ان کی زندگی بن کے رہ گیا ہے۔"(٧)

درج بالا پیراگراف میں مصنف مولانا صاحب کی تحریروں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ آپ کی تحریروں سے معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کیونکہ آپ عالم دین تھے اور تبلیغ کا بھی کام کرتے تھے لہذا آپ کی زیادہ تر تحریریں ہر طبقے کے لوگوں کے لیے ہیں۔ کیونکہ پیچیدہ الفاظ سے عبارت نا قابل فہم ہو جاتی ہے اور ایسے

الفاظ تبلیغ کے سلسلے میں موثر ثابت نہیں ہو سکتے۔ مصنف مزید لکھتے ہیں کہ آپ کی تحریریں جاندار ہونے کی وجہ سے قابل تقلید ہیں۔ نیز آپ صاحب باطن تھے اور علم کے ساتھ عمل بھی آپ کی زندگی بن گیا تھا۔

"جہانِ دِگر" میں بہار کوٹی صاحب کا بھی ذکر ہوا ہے اور ان کے اس تذکرے سے بہار کوٹی صاحب کے باطنی خدوخال کے حوالے سے بھی معلومات ملتی ہے مصنف آپ کے بارے میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> "بہار کوٹی صاحب کو یوں تو میں ایک عرصے سے جانتا تھا اور ان کے مداحوں میں تھا لیکن چونکہ وہ شفیق کوٹی صاحب کے خالہ زاد بھائی تھے اس سلسلے نے مجھے ان سے اور بھی قریب کر دیا تھا، میں جب بھی ان سے ملا ہوں ان کی طرف سے ایک نیا جذبہ، خلوص لے کر اٹھا ہوں، وہ سر سے پاؤں تک محبت اور شرافت کا مجسمہ تھے، بحیثیت شاعر میں نے بہت کم ایسے مخلص انسان انسان دیکھے ہیں جن کی زندگیوں میں میانہ تہیں نہ ہوں اور ظاہر و باطن میں شرک کو روا خیال نہ کریں۔"(۸)

مصنف نے بہار کوٹی صاحب کے بارے میں بتایا ہے کہ ایک عرصے سے بہار کوٹی صاحب کو جانتے تھے بلکہ ان کے مداحوں میں سے تھے۔ چونکہ آپ سراپا محبت تھے اس لیے احسان دانش کی اُنسیت بھی ان سے زیادہ ہو گئی تھی۔ مصنف کا ماننا ہے کہ بہت کم انہوں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو ظاہر اور باطن دونوں میں ایک جیسے ہوں۔ مگر بہار کوٹی صاحب کے ظاہر اور باطن میں کوئی تضاد نہ تھا مصنف نے عام فہم الفاظ میں بہار کوٹی کا تذکرہ بیان کر دیا ہے جس میں خاکے کے کا اہم عُنصر باطنی خدوخال کے حوالے سے معلومات ملتی ہے۔ باطنی خدوخال کے حوالے سے مصنف نے جاوید حیات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ابتدا میں وہ ان کا حُلیہ بتاتے ہیں۔ پھر اُن کی گفتگو پر بات ہوتی ہے۔ ساتھ ہی وہ باطنی خدوخال کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں۔ مصنف جاوید حیات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "وہ یوں تو نہایت ہشاش بشاش معلوم ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی گفتگو کے بعض بعض پڑاؤ پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر کا انسان تنہائی سے بیزار ہو کر کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہے۔"(۹)

احسان دانش کا ماننا ہے کہ جاوید حیات بظاہر ہشاش بشاش نظر انے والی شخصیت ہے۔ مگر بات کرتے ہوئے وہ بعض پڑاؤ پر کھُلنے لگتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ باطنی طور پر تنہائی سے فرار چاہتے ہیں اور اس سے وہ بیزار ہیں۔ دراصل وہ کھلی فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں اور گھٹن کا شکار نہیں رہنا چاہتے۔ احسان دانش نے باطنی خدوخال کے حوالے سے رضوان کا بھی ذکر کیا ہے۔ رضوان احسان دانش کے دوست قاضی امداد انصاری کے صاحبزادے

ہیں۔ مصنف کی جب رضوان سے ملاقات ہوئی اُس وقت رضوان ایف۔ ایس۔ سی کا طالبِ علم تھا۔ اُس نے اپنے فن کے حوالے سے جب احسان دانش کو اپنا کام دکھایا تو اُس وقت مصنف نے امداد انصاری کو مشورہ دیا تھا کہ یہ چلبلا آرٹسٹ ہے لہٰذا اس کو نیشنل کالج آف آرٹس میں داخل کروادو۔ پھر مصنف رضوان کی باطنی خدوخال کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> "آج وہی رضوان اعلی درجے کا آرکیٹکٹ ہے اور اس نے اپنی ایک ذاتی فرم قائم کرلی ہے مگر اب میرا خیال یہ ہے کہ اگر وہ اس فرم کی آمدنی پر اکتفا کرگیا اور اپنے فن میں ترقی کے زینوں پر گامزن نہ ہوا تو خسارے میں رہے گا، اس میں بڑی صلاحیتیں کلبلاتی ہوئی محسوس کر رہا ہوں، اس کے باطنی خدوخال بھی قیافے کی رُو سے اس کی بلندیوں کا پتہ دے رہے ہیں۔"(۱۰)

احسان دانش نے اس اقتباس میں رضوان کا تذکرہ کیا ہے جو اعلٰی درجے کا فن کار بھی ہے مصنف بتاتے ہیں کہ اُس نے ایک ذاتی طور پر اپنی کمپنی یا کاروباری ادارہ بنالیا ہے اور اسی پر وہ قناعت کرنے لگا ہے اگر وہ ترقی کے زینوں پر گامزن نہ ہوا تو خسارے میں چلا جائے گا۔ وہ بڑا ہی باصلاحیت شخص ہے۔ مصنف چونکہ رضوان کو جانتے ہیں اس لیے ان کو رضوان کے باطن سے بھی آگاہی حاصل ہے۔ لہٰذا مصنف قیاس کر رہے ہیں کہ اُس حرکات اور تاثرات سے اُس کی عمومی ظاہری حالت یہ بتارہی ہے کہ وہ ضرور بُلندی کا زینہ طے کرے گا۔

ب۔ ملبوس:

ملبوس بھی خاکہ نگاری کا ایک اہم عُنصر ہے۔ اِس کے ذریعے بھی شخصیت کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لباس ہی کے ذریعے اِنسانی شخصیت کو حقیقی طور پر پہچاننے مدد ملتی ہے۔ شخصیت کیسی ہے؟ اُس کو سمجھنے کے لیے لباس کافی کارآمد ہے۔ بعض اوقات انسان اپنے بارے میں کچھ چھپانا چاہارہا ہوتا ہے مگر لباس اُس کا تمام احوال بیان کر دیتا ہے۔ خاکہ نگار کے لیے اِس فن کو بیان کرنا مشکل اَمر ضرور رہا ہے مگر دیگر و بیشتر خاکہ نگاروں کے ہاں اِس فن کو دیکھا جاسکتا ہے۔ خاکے میں لباس کی اہمیت کو ڈاکٹر اسرائیل صدیقی کی اِس تعریف سے سمجھا جاسکتا ہے۔

> "کرادر نگاری کے ضمن میں مذکورہ شخصیت کے خدوخال، حرکات وسکنات، لباس، نفسیاتی اور ذہنی کیفیات و تغیرات سب کچھ پیش کیا جاتا ہے۔۔۔ خاکہ نگار کو شخصیت کے رنگ و روپ، وضع قطع اور عادات و اطوار کی جھلک بھی دکھانا ضروری ہے۔"(۱۱)

ڈاکٹر اسرائیل صدیقی کی یہ تعریف بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی بھی شخصیت کو سمجھنے اور واضح کرنے کے لیے باقی دیگر عناصر کے ساتھ لباس کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ جس سے شخصیت کی جھلک قاری کے سامنے آجاتی ہے۔

بقول یحیٰی امجد:

> ''خاکہ ایک تخلیقی صنفِ ادب ہے۔ جس میں زندہ شخصیت گوشت پوست کا بدن لیے، علمیت کی بھاری بھر کم عباؤں کو دَم بھر کے لیے اُتار کر، روزمرہ کے لباس میں نظر آتی ہیں اور ہم انھیں ویسا دیکھتے ہیں جیسا کہ وہ سچ مچ تھے نہ کہ جیسا ظاہر کرتے تھے۔''(۱۲)

یحیٰی امجد کی اِس تعریف سے یہ علم ہوتا ہے کہ خاکہ ایک تخلیقی صنفِ ادب ہے اس کے علاوہ صاحبِ خاکہ کے یہاں بہت سی چیزیں یا بہت سا مواد ایسا بھی مل جاتا ہے جو عام قاری کی دسترس میں نہیں ہوتا۔ لہٰذا خاکہ نگار اپنی بصیرت، بصارت اور تعلق کی بنا پر صاحبِ خاکہ کی تصویر ایسے کھینچ کر قاری کے سامنے رکھتا ہے جس میں بھاری بھر کم عباؤں کی بجائے روزمرہ کے لباس میں شخصیت نظر آتی ہے اور اِس میں شخصیت ایسے نہیں ہوتی جس طرح وہ اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہ رہی ہوتی ہے بلکہ ایسی ہوتی ہے جس طرح قاری اُس کو دیکھنا چاہ رہا ہوتا ہے اور یہی خاکہ نگار کا کمال بھی ہے۔ "جہانِ دِگر" میں خاکے کے اہم عُنصر ملبُوس پر بھی معلومات ملتی ہے۔ احسان دانش، نواب ملک امیر محمد خان کا تذکرہ بیان کر رہے ہیں۔ نواب صاحب کی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ اُنھوں نے اُس وقت قائدِ اعظم محمد علی جناح کی درخواست پر خطیر رقم چندے میں دی تھی جب یونینسٹ پارٹی کا ہر طرف طوطی بول رہا تھا۔ مصنف اِس عُنصر کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:'' انگلینڈ ریٹرن ہونے کے باوصف انھوں نے ہمیشہ اپنے قومی لباس کو ترجیح دی۔''(۱۳)

درج بالا اقتباس سے نواب ملک امیر محمد خان کی شخصیت کا پہلو مزید واضح ہوتا ہے کہ اُن میں حُب الوطنی پائی جاتی ہے اور اپنے لباس کی قدر و منزلت اُن کے دِل میں کِس قدر موجود تھی کہ انگلینڈ جانے کے بعد بھی یہ اُن کے دِل سے نہ نکل سکی۔ "جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے یوسف بخآری دہلوی کا بھی ذِکر کیا ہے۔ جس زمانے میں احسان دانش نے اِن کے بارے میں تحریر کیا اُس زمانے میں یوسف بخآری اردو بورڈ میں تدوینِ لغت کے سلسلے میں کام کر رہے تھے۔ مصنف آپ کے لباس کے حوالے سے یوں تحریر کرتے ہیں:'' وہ قدیم تہذیب کے شرفاء کی طرح خلیق ملنسار اور شیریں گفتار انسان ہیں اُن کا چہرہ، لباس، تحریر اور رکھ رکھاؤ اُن کے اصل دہلوی ہونے کا روشن ثبوت ہے۔''(۱۴)

مذکورہ پیراگراف میں احسان دانش نے یوسف بخاری کے بارے میں یہ معلومات فراہم کر دی ہے کہ وہ قدیم تہذیب کے شرفا کی طرح رہتے تھے۔ اُن کے ملنے کا انداز، شیریں گفتار، لباس اور تحریر سے پتا چل جاتا تھا کہ وہ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ کیونکہ دہلی کے لوگوں میں یہ صفات موجود تھی جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یوسف بخآری سے ملنے والا ہر شخص اِس بات کا معترف ہو جاتا تھا کہ دہلویت تہذیب میں کس طرح کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ احسان دانش ملبوس کے حوالے سے ایک افیونی کے بارے میں کچھ یوں رقمطراز ہوتے ہیں۔

> "ایک دن میں گیلانی بک ڈپو میں ایک کُتب فروش سے کچھ باتیں کر رہا تھا ایک ملگجے رنگ کا اترتی سی عمر کا انسان آ کر کھڑا ہو گیا اس کا چہرہ اچھور کی طرح سوکھا سوکھا سا تھا اور لباس کے اعتبار سے نچا کھسٹا اس اصل مرغ کی طرح جو کئی پالیاں لڑ چکا ہو۔۔۔۔"(۱۵)

درج بالا اقتباس میں مصنف نے یہ بتایا ہے کہ وہ گیلانی بک ڈپو میں کُتب فروش سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک میلا کچھ اُجلے سے رنگ کا ڈھلتی سی عمر کا انسان آ کھڑا ہوا۔ اس شخص کا چہرہ اچھور کی طرح سوکھا تھا یعنی وہ شخص بہت دُبلا پتلا تھا۔ اس اقتباس میں مصنف نے تشبیہ کا بھی استعمال کیا ہے جس سے نثر میں حُسن پیدا ہو گیا ہے۔ مصنف اُس کے لباس کے بارے میں مزید بیان کرتے ہیں کہ اس کا لباس محسوس ہوتا تھا کہ اس میں کھونچے یا خراشیں پڑ چکی ہیں۔ وہ شخص مفلوک الحال محسوس ہوتا تھا۔ اُس مرغ کی طرح جو کئی مقابلے لڑ چکا ہو اور اس کے جسم پر نشان پڑ چکے ہوں یا پھر اس کے پر گر چکے ہوں۔ مصنف نے اسی طرح مولانا حمید اللہ صاحب کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جس میں ان کی لباس کے بارے میں بات کی گئی ہے مولانا صاحب کا تذکرہ مصنف کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> "علمی سلسلے کی ایک کڑی مولانا حمید اللہ صاحب بھی ہیں جو فرانس جیسے ملک اور فرانس میں بھی پیرس جیسی جگہ بیٹھ کر دین کی خدمت اور شعور حق کی تقسیم کر رہے ہیں، مجھے ایک کرم فرما عاشق عمران عباسی نے بتایا کہ انہوں نے فرانسیسی میں قرآن کی تفسیر بھی لکھی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اسے صرف مولانا حمید اللہ صاحب ہی کر سکتے ہیں، انہوں نے پیرس جیسے فیشن پرست شہر میں رہتے ہوئے اج تک شیر وانی اور پاجامے سے کنارہ نہیں کیا اور اس عالم میں جو وہاں ان کی قدر و منزلت ہے اسے دیکھ کر فرانسیسیوں کی حقیقت پسندی اور مردم شناسی کو داد دینا پڑتی ہے۔"(۱۶)

درج بالا پیراگراف میں مصنف مولانا حمید اللہ کا تذکرہ بیان کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ وہ تعلیمی سلسلے کی ایک کڑی ہیں اور ملک فرانس یا پیرس میں بیٹھ کر دین کی خدمت اور شعور تقسیم کر رہے ہیں۔ کسی دوسرے ملک میں بیٹھ کر جن کے زیادہ تر پیروکار کتھیولک جیسے مذہب کی پیروی کرتے ہوں مشکل امر ہے مگر آپ یہ کام اپنی

پوری تن دہی سے کر رہے ہیں۔ آپ نے وہاں پر فرانسیسی زبان میں قرآن کی تفسیر بھی لکھی ہے۔ مصنف مزید بتاتے ہیں کہ پیرس ایک فیشن پرست شہر ہے مگر مولانا صاحب وہاں پر رہتے ہوئے بھی اپنے ملک کے لباس کو اہمیت دیتے ہیں۔ اور آج تک شیر وانی اور پاجامے کو زیبِ تن کرتے ہیں۔ اِس کے باوجود وہاں کے لوگ آپ کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف بتاتے ہیں کہ وہاں لوگ حقیقت پسند ہیں اور اچھے برے کی تمیز ہونے کی وجہ سے داد کے مستحق ہیں۔

"جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے ایک رئیس زادے کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو تھا تو رئیس زادہ مگر پیسے پیسے کو تنگ ہو چکا تھا۔ اُس کے لباس کے بارے میں احسان دانش یوں تذکرہ کرتے ہیں۔

> "اتنے میں ایک نوعمر نوجوان ایک قیمتی لباس میں ملبوس آیا۔ پانچ روپے عبد الرحمان کو دے کر ایک پان لیا اور جو پان اس کے منہ میں تھا وہ فٹ پاتھ کی دیوار کے قریب تھوک کر تازہ پان کھا کے چلتا بنا۔ وہ دو چار ہی قدم گیا ہو گا کہ سامنے تھڑے پر بیٹھا ہوا نوجوان بلی کی طرح لپک کر آیا اور اس کا اگلا ہوا پان اٹھا کے کھا لیا۔ عبد الرحمان نے کہا دیکھا جناب اس نوجوان کے پاس پیسے نہیں ہیں تو دوسرے کا اگلا ہوا پان کھاتا ہے۔"(۱۷)

مذکورہ پیراگراف سے معلوم ہوتا ہے کہ غربت اور افلاس کے باعث انسان کیا کچھ کر گزرتا ہے انسان کو جب کسی چیز کی لت پڑ جاتی ہے تو وہ اس کے بغیر گزارہ نہیں کر سکتا۔ اس پیراگراف میں مصنف نے ایک رئیس زادے کا تذکرہ کیا ہے جو چند وجوہات کی بنا پر کسمپرسی میں مبتلا ہو گیا ہے۔ احسان دانش بیان کرتے ہیں کہ ایک نوعمر نوجوان آیا جس نے نہایت قیمتی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ مگر جیب میں پیسے نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے شخص کا تھوکا ہوا پان اٹھا کر منہ میں رکھ لیتا ہے۔ اس پیراگراف میں بھی مصنف نے ایک نوجوان کو بلی سے تشبیہ دے کر اپنی نثر میں خوبصورتی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ "جہانِ دِگر" میں مسیح الحسن بقا نقوی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جس میں لباس کے حوالے سے معلومات ملتی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> "ایک روز میں دلی مسلم ہوٹل لاہور میں چائے پینے گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک سانولا سا لڑکا سٹول پر بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے اس کے چہرے پر کچھ ایسی کیفیت تھی جو میلے کچیلے لباس کے باوجود آواز دیتی تھی اس کی پیشانی روشن ابھری ہوئی اور فراخ تھی میں نے اسے اشارے سے بلایا اور پوچھا تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ لکھ رہا ہوں لڑکے نے جواب میں کہا۔"(۱۸)

اس پیراگراف میں مصنف نے مسیح الحسن بقا نقوی کا تذکرہ بیان کیا ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ مسلم ہوٹل لاہور میں چائے پینے گئے تھے تو اسی دوران ایک سانولے سے لڑکے پر ان کی نظر جا ٹھہرتی ہے وہ بیٹھ کر کچھ

لکھ رہا ہوتا ہے۔ اس کا لباس میلا کچیلا ہوتا ہے مگر جاذبیت بدرجہ اُتم موجود ہوتی ہے۔ مصنف اس کا حلیہ یوں بیان کرتے ہیں کہ اس کی پیشانی روشن، ابھری ہوئی اور فراخ تھی معلوم ہوتا تھا یہ لڑکا آنے والے وقتوں میں نام روشن کرے گا بعد میں یہی لڑکا شاعر بنا۔ یہ لڑکا چونکہ یتیم تھا مگر حلیے میں جاذبیت تھی اس کے باوجود میلے کچیلے لباس سے اس کی غربت کا احوال معلوم ہو رہا تھا مصنف نے مسیح الحسن بقا نقوی کے اس تذکرے میں مکالماتی انداز اپنایا ہے اور اس کے لباس سے اس کی غربت کا احوال بھی بیان کر دیا ہے نیز اس تذکرے میں مصنف کی زبان عام فہم اور روزمرہ کے مطابق ہے جسے قاری باآسانی مسیح الحسن بقا نقوی کے احوال سے متعلق معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

احسان دانش نے " جہانِ دِگر" میں جمیل کا بھی تذکرہ کیا ہے جمیل آرٹسٹ ہے اور اس کو مصنف نے آرٹسٹ کے عنوانات میں ہی رکھا ہے۔ جمیل آرٹسٹ کے اس تذکرے میں لباس کے حوالے سے بھی معلومات ملتی ہے اور جمیل آرٹسٹ کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے لباس کافی اہمیت رکھتا ہے مصنف لکھتے ہیں:

> ”کراچی کے ایک معمولی سے کوارٹر میں جمیل آرٹسٹ رہتا ہے وہ سیدھا سادا انسان کرتے پاجامے میں ملبوس ایک تھیلا ہاتھ میں لیے اکیلا مختلف مقامات پر دیکھا جاتا ہے بیک نظر اس پر آرٹسٹ، ہونے کا گمان اس لیے نہیں ہوتا کہ آج کل آرٹسٹ اپنی ہیئت کذائی ہی الگ رکھتا ہے۔۔۔۔ وہ فنکار ہے صحیح معنوں میں فنکار، اس میں ایکٹروں والی اداکاری نہیں، اس کی خصوصیت اس کا فن ہے، لباس نہیں۔“(۱۹)

مذکورہ اقتباس میں مصنف نے جمیل آرٹسٹ کا ذکر کیا ہے جمیل نقش و نگار بناتا ہے۔ مصنف بتاتے ہیں کہ جمیل کراچی کے ایک معمولی کوارٹر میں رہتا ہے وہ سیدھا سادا انسان ہے اس میں تکبر نام کی چیز نہیں کُرتے پاجامے میں ملبوس تھیلا ہاتھ میں پکڑے مختلف جگہوں پر نظر آتا ہے۔ مصنف کا ماننا ہے کہ وہ لباس سے آرٹسٹ محسوس نہیں ہوتا۔ کیونکہ آرٹسٹوں کا انداز ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اس پیراگراف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف جمیل آرٹسٹ سے متاثر ہیں اور اُن کی غیر جانبداری کے ذریعے تعریف کر رہے ہیں۔ احسان دانش کا ماننا ہے کہ جمیل صحیح معنوں میں فنکار ہے کیونکہ وہ اداکاری سے کام نہیں لیتا۔ اس کی خوبی یا خصوصیات اس کا کام ہے۔ لباس نہیں۔ لہٰذا جمیل کام پر توجہ دیتا ہے اور لباس ایسا استعمال کرتا ہے جس سے اُس کی سادگی ظاہر ہوتی ہے۔ احسان دانش نے " جہانِ دِگر" میں سلطان آرٹسٹ کا بھی ذِکر کیا ہے۔ سلطان بنگال کا رہنے والا تھا اور پیشے کے لحاظ سے آرٹسٹ ہے اسی لیے لوگ اِس کو سلطان (بنگالی آرٹسٹ) بھی کہتے ہیں۔ سلطان بنگالی کے اِس تذکرے میں جس کو مصنف نے اِس کتاب میں بیان کیا ہے لباس کے حوالے سے بھی بات کی گئی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

"ایک دن میں اپنے مزنگ والے مکان میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ باہر سے کسی نے آواز دی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو سولہ، سترہ سال کا گہرے گندمی رنگ کا ایک لڑکا گھٹنوں تک اونچی دھوتی باندھے ہاتھ میں ایک ٹاٹ کا تھیلا لیے کھڑا ہے۔"(۲۰)

درج بالا اقتباس میں مصنف نے اپنے مکان کا تذکرہ کیا ہے کہ وہاں پر بیٹھ کر وہ لکھنے میں مصروف ہوتے ہیں کہ ایک لڑکا جس کی عمر سولہ، سترہ سال کی تھی آواز دیتا ہے۔ اُس کے بعد مصنف اس کا حلیہ بیان کرتے ہیں کہ اس کی رنگت گہری گندمی تھی اس کے ساتھ ہی اُس کی لباس کا بھی تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ لڑکا گھٹنوں تک اونچی دھوتی باندھے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ٹاٹ کا ایک تھیلا تھا۔ مصنف نے بڑی خوبصورتی سے سلطان بنگالی کا نقشہ کھینچ کر قاری کے سامنے رکھ دیا ہے کہ وہ کس طرح عمر، حُلیے اور لباس سے معلوم ہوتا تھا۔ مصنف نے یہ نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ معلوم ہوتا ہے قاری کے سامنے سلطان بنگالی آرٹسٹ کھڑا ہے اور وہ اُس کو دیکھ بھال رہا ہے۔ ایک کامیاب خاکہ نگار کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ شخصیت کو اس طرح بیان کرے کہ وہ شخصیت قاری کے سامنے آموجود ہو جس طرح مصنف نے اس اقتباس میں بیان کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تذکرے میں خاکہ نگاری کا اہم عُنصر ملبوس بھی موجود ہے جس سے شخصیت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ "جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے خورشید خاور کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس تذکرے میں لباس کے حوالے سے بھی معلومات ملتی ہے جس سے خورشید خاور کی شخصیت مزید واضح ہو جاتی ہ احسان دانش خورشید خاور کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"گہرا گندمی رنگ، چھریرا بدن، آنکھوں پر سنہری کمانی کی عینک جو ان کی شخصیت کی ترجمان ہے، خوش لباسی کے ساتھ اِن کی خوش خلقی لوگوں کو اور بھی گرویدہ کر لیتی ہے اور ہمیشہ اسی ٹھسے سے رہتے ہیں غالباً یہی خوش ذوقی کالج کے طالب علموں میں بھی مقبول رکھتی ہے۔"(۲۱)

درج بالا اقتباس میں مصنف نے خورشید خاور کا حُلیہ بیان کیا ہے۔ حُلیہ نگاری خاکے کا اہم عُنصر ہے۔ اِس کے ذریعے شخصیت ایسے محسوس ہوتی ہے گویا قاری اس کو دیکھ بھال رہا ہے۔ اور وہ شخصیت قاری کے سامنے چل پھر رہی ہے اور قاری اسے دیکھ رہا ہے۔ اِس پیراگراف میں مصنف نے خورشید خاور کی رنگت کا تذکرہ کیا ہے کہ اُن کا رنگ گہرا گندمی تھا۔ گہرے گندمی رنگ سے مراد وہ رنگ ہے جو گندم کی فصل کے پکنے کے بعد حاصل ہونے والی گندم کے دانوں کا ہوتا ہے۔ یہ رنگ عموماً بھورے اور سنہری رنگ کا مُرکب ہوتا ہے۔ بدن چھریرا مراد یہ کہ وہ پتلے لمبے اور سڈول تھے۔ سنہری کمانی عینک کا استعمال کرتے تھے۔ یہ عینک عموماً دیہاتی ہوتی ہے جس سے شخصیت میں نکھار آجاتا ہے اِس کے علاوہ مصنف بتاتے ہیں کہ وہ خوش لباس ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی گفتگو بھی کرتے تھے۔ لباس جو کہ شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے وہ خورشید خاور نے زیبِ تَن کیا ہوتا تھا جس سے شخصیت اُن کی اور واضح ہو جاتی تھی۔ بول چال سے وہ لوگوں کو اپنا گرویدہ کر لیتے تھے وہ ایک بارعب اور دبدبے والے شخص تھے جس سے وہ کالج

کے طالب علموں کو اپنا گرویدہ کر لیتے تھے۔ مصنف نے خورشید خاور کا حلیہ بڑی خوبصورتی سے بیان کیا جس سے خورشید خاور کی شخصیت نے نکھر کا سامنے آجاتی ہے۔

" جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے ثریا زیبا کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اِن کے اس تذکرے میں لباس کے حوالے سے بھی بات کی گئی ہے۔ لباس جو کہ خاکہ نگاری کا اہم عُنصر ہے۔ جس سے شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے کہ شخصیت کیسی ہے۔ ثریا زیبا کے اس تذکرے میں مصنف لکھتے ہیں:

> "ثریا زیبا نہایت سیدھا سادہ شعر کہتی ہے اس کے اشعار کا مفہوم معنی کا ہجوم نہیں رکھتا، وہ بلند نظر سے مشاعرے میں شعر نہیں پڑتی، وہ اس جدید دور میں قدیم رکھ رکھاؤ کی لڑکی ہے مگر جدید اصول حیات سے بھی بے بہرہ نہیں، اس کے لباس میں ایک شریفانہ تکلف اور لہجے میں ایک دلکش جھنکار ہے، وہ اشعار کے مفہوم پر مسکراہٹوں کا جھول نہیں چڑھاتی، اسے گفتگو کا سلیقہ بھی ہے اور سلیقے پر رنگ برنگ کی جھالر لگانے کا شعور بھی!"[۲۲]

اس اقتباس میں احسان دانش نے ثریا زیبا کا تذکرہ کیا ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ وہ نہایت سیدھا سادہ شعر کہتی ہیں ان کے اشعار میں معنوں کا ہجوم نہیں ہوتا۔ وہ بلند نظر سے مشاعروں میں اشعار نہیں پڑھتی۔ دور جدید میں اُن کے ہاں قدیمی رکھ رکھاؤ ہے مگر وہ جدید اصولوں سے بھی واقف ہیں۔ احسان دانش نے ثریا زیبا کے لباس کے حوالے سے جو بات کی ہے اُس کے ذریعے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کے ہاں شریفانہ تکلف ہے اور اُن کے لہجے میں ایک دلکش جھنکار ہے مراد یہ کہ اُن کا لہجہ میٹھا ہے اُن کے اشعار کے مفہوم پر مسکراہٹوں کا جھول نہیں۔ مصنف ثریا زیبا کے بارے میں مزید بتاتے ہیں کہ آپ کو گفتگو کا سلیقہ بھی آتا ہے اور آپ کو اس سلیقے پر جھالر لگانے کا شعور بھی ہے۔ مختصراً یہ کہ مصنف نے ثریا زیبا کا تذکرہ چند سطور میں اِس طرح سمیٹ کر رکھ دیا ہے جس سے ثریا زیبا کی شخصیت پوری طرح واضح ہو کر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ اور اِسی اقتباس میں مصنف نے ثریا زیبا کے لباس کا تذکرہ بھی کر دیا ہے جس سے اُن کے شریفانہ تکلف کی جھلک بھی سامنے آجاتی ہے۔ اور ملبوس جو کہ خاکہ نگاری کا ایک اہم عُنصر ہے کے حوالے سے معلومات بھی مل جاتی ہے۔ اِس کے لیے مصنف نے عام فہم اور روزمرہ کی زبان کا استعمال کیا ہے جس سے قاری با آسانی معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

ج۔ چال ڈھال:

خاکہ نگاری کا ایک اہم عُنصر چال ڈھال ہے۔ اِس کے بغیر شخصیت کو سمجھنا مشکل ہے۔ جبکہ چال ڈھال کے ذریعے شخصیت کو سمجھنے میں سہولت ہو جاتی ہے۔ جس طرح خاکہ نگار خاکہ لکھتے وقت خاکے کے حوالے سے مواد

جمع کرنا شروع کرتا ہے تو اُس کی سوچ باقی حصوں کی طرف منتقل ہوتی ہے تو ساتھ ہی اس کی سوچ کا محور انسان کی چال چلن بھی بنتی ہے۔ اِس عناصر کے ذریعے شخصیت متحرک صورت میں ہمارے سامنے آ جاتی ہے اُردو کے جتنے بھی خاکہ نگار ہیں، اُن کے ہاں اس فن کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اِس کے ذریعے ہی صاحب خاکہ کی مکمل تصویر کاری کے سامنے آتی ہے خاکہ نویس بھی یہ چاہا رہا ہوتا ہے کہ وہ جس شخصیت پر خاکہ لکھ رہا ہے اس کی مکمل اور واضح تصویر سامنے آئے۔ اُس کے لیے خاکہ نگار خاکے کے اِس عناصر کا استعمال بھی کرتا ہے۔ اِس حوالے سے گُل ناز بانو کچھ یوں رقمطراز ہیں:

> ”خاکہ دراصل ایک ایسا شخصی مضمون ہے جس میں کسی شخصیت کے اہم، نمایاں اور منفرد پہلوؤں کو اس طرح اُجاگر کیا جائے کہ وہ شخصیت ایک جیتی جاگتی، چلتی پھرتی متحرک صورت میں قاری کے سامنے آجائے۔“(۲۳)

ڈاکٹر گُل ناز بانو کے درج بالا اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاکہ نگار کو شخصیت کے سمجھنے کے لیے اُن تمام پہلوؤں کو اپنانا چاہیے جس سے شخصیت قاری کے سامنے واضح ہو جائے اگر قاری نے اِس سے پہلے اُس شخص کو دیکھا بھالا نہ ہو تو خاکہ پڑھ کے صاحبِ خاکہ کی شخصیت سے آگاہی حاصل کرلے۔ اور یہ تصویر جیتی جاگتی، چلتی پھرتی متحرک صورت میں ہونی چاہیے جس سے قاری مکمل حظ حاصل کرسکے۔ "جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے جو تذکرے قلمبند کیے ہیں اُن تذکروں میں خاکے کے ایک اہم عُنصر چال ڈھال پر بھی معلومات ملتی ہے۔ مثلاً حبیب جالب کی تذکرے میں وہ بیان کرتے ہیں۔

> ”زرد شلغم جیسا رنگ، صحرائے عرب کی طرح کھوپڑی، پیشانی سے گدی تک چندیا صاف کچوری کی طرح گال اور پائپ کی تھیلی کی طرح دہن من موجی قسم کا انسان بڑے پنچوں کا پجامہ پہنے لپ چھپ کرتا جب وہ ٹی ہاؤس کی طرف جاتا ہے تو قابلِ دید منظر ہوتا ہے۔ کسی کی ہنسی اُڑائی، کسی پر پھبتی کسی، کسی پر آوازہ لگایا کہیں میز پر کوئی لطیفہ چھوڑا، کہیں چلتے چلتے چٹکلا داغا غرض کہ یہ شخص اپنی دھج کا اکیلا انسان ہے۔“(۲۴)

درج بال اقتباس میں احسان دانش نے تشبیہ کا استعمال کر کے مزاح پیدا کیا ہے۔ مثلاً زرد شلغم جیسا رنگ، صحرائے عرب کی طرح کھوپڑی، پیشانی سے گدی تک چندیا صاف۔ احسان دانش نے حُلیہ نگاری پر اتنا بے رحم نقشہ کھینچا ہے کہ حبیب جالب اگر اِس تذکرے کو پڑھتے اور احسان دانش سامنے ہوتے تو حبیب جالب احسان دانش کو ہزار صلواتیں سناتے مگر احسان دانش کہاں اِس کی پرواہ کرنے والے تھے۔ اُنہوں نے اِس طرح کے کئی اور تذکرے بیان کیے ہیں۔ تھوڑا آگے چل کر احسان دانش حبیب جالب کے بابت لکھتے ہیں کہ وہ من موجی قسم کے

انسان تھے۔ من موجی دراصل فارسی کی ایک ترکیب ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن کے مزاج میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت موجود تھی۔ بڑے پائنچوں کا پجامہ پہن کر وہ جب ٹی ہاؤس کی طرف جاتے تھے تو یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ یہاں پر احسان دانش نے حبیب جالب کی چال ڈھال کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ چلتے ہوئے کسی کی ہنسی اُڑا رہے ہیں تو کسی پر آواز کس رہے ہیں اور کسی پر لطیفہ۔ حبیب جالب حتیٰ کہ چلتے چلتے کسی پر چٹکلا داغ رہے ہیں۔ حبیب جالب کا ایک الگ ہی دبدبہ تھا۔ احسان دانش نے اس طرح سے حبیب جالب کا نقشہ کھینچا ہے کہ حبیب جالب کی شخصیت متحرک ہو کر قاری کے سامنے آجاتی ہے اور اِس طرح کی چیزیں عموماً اُردو کے بڑے کامیاب خاکہ نگاروں کے ہاں بھی ملتی ہیں۔

احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جس کا عُنوان انھوں نے "مردہ غائب" دیا ہے۔ اس واقعے میں وہ میرٹھ شہر کا ذِکر کرتے ہیں۔ اِس تذکرے میں میرٹھ شہر کے ایک درزی کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اور اس تذکرے میں خاکے کے اہم عُنصر چال ڈھال پر بھی مواد پیش کیا گیا ہے۔ درزی کی چال ڈھال سے کردار کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مصنف اس بارے میں لکھتے ہیں:

> "اِسی بات پر اِس کے جاننے والے سب لوگ اس کا احترام کرتے تھے، ایک دفعہ رات کے دو بجے محفلِ میلاد ختم ہوئی اور وہ وہاں سے ایک عجیب و غریب کیفیت میں سرشار گھر کی طرف چلتا آرہا تھا، جب وہ کمبوہ دروازے آیا تو اس نے دیکھا کہ ایک جنازہ آرہا ہے مگر اُسے تین آدمی اٹھائے ہوئے ہیں، دو آگے کے دو پائیوں پر اور ایک پیچھے! یہ دیکھ کر اس پر تو ایک دوسرا ہی عالم طاری ہو گیا، اس نے ازراہ ہمدردی لپک کر پچھلے ایک پائے کو کندھے پر لے لیا اور چلنے لگا ۔۔۔"(۲۵)

احسان دانش نے عام فہم الفاظ کا استعمال بہت زیادہ کیا ہے۔ جہاں اُنہوں نے عام فہم الفاظ کا استعمال کیا وہی پر اُنہوں نے صاحبِ تذکرہ شخصیت کے ساتھ بھی پورا انصاف کیا ہے۔ مثلاً اُوپر والے تذکرے میں جب وہ میرٹھ والے درزی کے بابت بیان کر رہے ہیں تو اِس کے عزت و احترام کا بھی تذکرہ کر رہے ہیں جو لوگ اِس کے ساتھ اس کے اچھے اخلاق کی وجہ سے عموماً روا رکھتے تھے۔ احسان دانش میرٹھ والے درزی کے بابت یہ بیان کرتے ہیں کہ میلاد کے جب اُس کے قدم گھر کی طرف اُٹھ رہے تھے تو ان میں عَجب سرشاری تھی اور یہ سرشاری عموماً ہر مذہبی انسان کے ہاں نظر آتی ہے۔ جب وہ اِس طرح کی محفل میں بیٹھتا ہے یا پھر محفل کے اِختتام پر ہوتی ہے۔ مگر یہ کیفیت اچانک جنازہ دیکھتے ہی بدل جاتی ہے اور اُس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ آجاتی ہے اور اُس پر سکتہ طاری ہو

جاتا ہے اور وہ بھی باقی لوگوں کے ساتھ ازراہِ ہمدردی اُس کو کندھا دینے لگتا ہے احسان دانش نے چال ڈھال سے اس درزی کا ایسا برتاؤ قاری کے سامنے بیان کیا ہے جو عموماً وجد کی حالت میں کسی شخص کا بھی ہو سکتا ہے۔

احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں تبر شاہ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اِن کے اِس تذکرے میں خاکے کے اہم عُنصر چال ڈھال پر بھی معلومات ملتی ہے۔ علاوہ ازیں تبر شاہ کے کردار کو سمجھنے میں بھی آسانی ہو جاتی ہے۔

"تبر شاہ کا اصل نام کسی کو معلوم نہیں لیکن اس کی دھوم دور دور تھی، اس نے مظفر نگر میں کالی ندی کے کنارے ایک درخت کے نیچے چبوترے کو اپنا مسکن بنایا ہوا تھا، وہی ایک شاخ میں اس کا ہیبت ناک اور چمکتا ہوا تبر لٹکا رہتا اور وہیں اس کی دھونی تھی جس میں ہر وقت ایک لکڑ پڑا دھند کتا رہتا تھا، تبر شاہ تبر شاہ ایک گھبر و صندلی رنگ کا توانا تندرست اور چلتے ہوئے ہار گوڑ کا مضبوط بانکا چھیلا قسم کا درویش تھا۔۔"[۲۶]

مذکورہ اقتباس میں احسان دانش کے کچھ الفاظ خالصتاً طنز پر مبنی ہیں۔ جہاں وہ ذکر کرتے ہیں کہ تبر شاہ کا اصل نام کسی کو معلوم نہیں تھا اور اس کے مسکن کا تذکرہ کرتے ہیں وہی وہ طنز کا ابتذال والا حربہ بھی اپناتے ہیں۔ وہیں ایک شاخ میں اس کا ہیبت ناک اور چمکتا ہوا تبر لٹکا رہتا جیسے الفاظ مثبت پیرائے میں استعمال نہیں کیے۔ بلکہ طنز کے طور پر اِن کو برت کے قاری کے سامنے اُس کا حُلیہ بیان کیا ہے۔ احسان دانش جہاں تبر شاہ کا حُلیہ قاری کے سامنے بیان کر رہے ہیں وہی وہ تبر شاہ کی چال ڈھال کے بابت لکھتے ہیں کہ وہ گھبر و اور جسمانی حوالے سے تندرست اور توانا ہونے کی وجہ سے ایک مضبوط درویش محسوس ہوتا تھا۔ یہاں پر احسان دانش نے حُلیہ نگاری اور چال ڈھال کا استعمال کر کے تبر شاہ کا کردار قاری کے سامنے متحرک کر دیا ہے۔

احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں فیض جھنجھانوی کا بھی تذکرہ بیان کیا ہے۔ اور ان کو شعراء کی صَف میں کھڑا کیا ہے۔ احسان دانش کے اِس تذکرے میں جہاں فیض جھنجھانوی کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ قاعدے کے شاعر ہیں ساتھ ہی چال ڈھال پر بھی مواد مل جاتا ہے مصنف اس بارے میں لکھتے ہیں: "فیض جھنجھانوی کے کئی بے فیض در پے آزار تھے اور فیض تھے کہ سیدھے سبھاؤ اُستادی کی چکا چوند میں چلتے رہے، ماحول کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا! [۲۷]

مذکورہ اقتباس میں احسان دانش نے فیض جھنجھانوی کے خصائص قاری کے سامنے بیان کیے ہیں۔ اور فیض جھنجھانوی کے بارے میں قاری کو بتایا ہے کہ وہ کتنی بڑی شخصیت تھی۔ آپ کی زندگی میں بہت سے لوگ ایسے آئے

جنہوں نے اپ کو اَذیت اور تکلیف پہنچائی مگر اُس کے باوجود وہ بغیر کسی بناوٹ یا چالا کی کے اُستادی کی دُھن میں چلتے رہے اور سبھی کو حیران کر دیا۔ فیض نے اس ماحول کی طرف کبھی توجہ نہیں کی جس نے اس کے راستے کو مسدود کرنا چاہا۔ ایسے اوصاف بہت کم لوگوں میں نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ناظر عاشق ہر گانوی، خاکہ نگاری کا فن اور اردو خاکہ نگار، مشمولہ شش ماہی فکر و تحقیق، قومی کونسل برائے فروغ قومی زبان، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص ۸

۲۔ محمد علیم الدین، رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۹۵ء، ص ۱۲۱

۳۔ احسن دانش، جہانِ دِگر، الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۱ء ص ۷۴

۴۔ ایضاً، ص ۲۶۲

۵۔ ایضاً، ۲۹۰ تا ۲۹۱

۶۔ ایضاً، ۲۹۷

۷۔ ایضاً، ۳۰۲

۸۔ ایضاً، ۳۰۶

۹۔ ایضاً، ۳۳۱

۱۰۔ ایضاً، ۳۴۲

۱۱۔ اسرائیل صدیقی، ڈاکٹر، یادگار مرزا فرحت اللہ بیگ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۰۲

۱۲۔ یحییٰ امجد، فن اور فیصلے، مکتبہ عالیہ، لاہور، طبع اول، ۱۹۶۹ء، ص ۲۶

۱۳۔احسان دانش، جہانِ دِگر، خزینہ علم و ادب، الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۷

۱۴۔ایضاً، ص ۸۷

۱۵۔ایضاً، ص ۲۳۱

۱۶۔ایضاً، ص ۳۰۱

۱۷۔ایضاً، ص ۸۲

۱۸۔ایضاً، ص ۳۱۲

۱۹۔ایضاً، ص ۳۴۴

۲۰۔ایضاً، ص ۳۴۵

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۶۹

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۸۴

۲۳۔ گلناز بانو، ڈاکٹر، صوبہ سرحد میں خاکہ نگاری، گندھارا ہند کو اکیڈمی، پشاور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۰

۲۴۔ احسان دانش، جہانِ دِگر، ص ۳۶۴

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۰۰

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۰۷

باب سوم:

"جہانِ دِگر" میں شخصی عادات وخصائل کا تجزیاتی مطالعہ

الف۔ معمولات وترجیحات:

خاکہ نگاری کا ایک اہم عُنصر معمولات وترجیحات بھی ہے۔ شخصیت کو سمجھنے کے لیے معمولات وترجیحات بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جس طرح خاکہ نگار کے ہاں دیگر کئی مقاصد ہوسکتے ہیں وہاں پر معمولات وترجیحات کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ چونکہ خاکہ نگار کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ خاکہ کی مکمل تصویر قاری کے سامنے رکھ دے۔ اِس کے لیے وہ خاکے کے اِس اہم عُنصر معمولات وترجیحات کا استعمال کرتا ہے۔ معمولات وترجیحات ایک ترکیب ہے۔ ریختہ پر معمولات کی تعریف یوں ملتی ہے۔

"وہ کام جو آدمی روز انجام دیتا ہو، روزمرہ کے امور۔ یا پھر وہ باتیں جن کی عادت ہو۔ نیز جس کی عادت بن گئی ہو۔"[۱]

درج بالا تعریف کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ روزمرہ کے کاموں میں ایسا کام جس کی روزانہ کی بنیادوں پر عادت ہو گئی ہو یا پھر ایسی باتیں یا کام جو بار بار کیے جانے کی وجہ سے پختہ ہو گئے ہوں۔ ریختہ پر ترجیح کے معنی کچھ یوں درج ہیں۔

"برتری، بہتری، فوقیت، فضلیت"[۲] معمولات وترجیحات کو بطورِ ترکیب استعمال کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسا کام یا ایسی باتیں جو روزمرہ استعمال ہوں اور اِن کو دوسرے کاموں پر یا دوسری باتوں پر ترجیح دی جاتی ہو۔

"جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے شخصیات کی تصویر کشی کرتے ہوئے معمولات وترجیحات کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ معمولات وترجیحات چونکہ خاکے کا ایک اہم عُنصر ہے اِس کے ذریعے شخصیت مکمل طور پر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ احسان دانش اس کتاب میں ایک درزی کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ درزی میرٹھ کا رہنے والا تھا۔ اور اُس کے نیک سیرت اور متقی وپرہیز گار ہونے کے بارے میں بتایا ہے۔ ساتھ میں راولپنڈی کے ایک درزی کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ راولپنڈی والے درزی کا ذِکر کرنے کے بعد میرٹھ والے درزی کے بارے میں احسان دانش لکھتے ہیں:

"اِسی طرح میرٹھ والا درزی بھی بھلا آدمی تھا، روزہ ونماز کے علاوہ اُس کے دن مزدوری اور راتیں عبادت میں گزرتی تھیں، شہر میں جہاں قوالی یا میلاد شریف ہوتا اس میں یہ ضرور شریک ہوتا اور ساری ساری رات حق ہو کے ہنگامے میں گزار دیتا آخر آخر میں وہ باقاعدہ صوفی ہو گیا تھا اور محفل سماع میں اِس پر صوفیاء جیسی کیفیت بھی طاری ہو جاتی تھی، وہ

گھنٹوں حال کی کیفیت میں رہتا اور اس کے حال کے لیے عام صوفیوں کی طرح ہارمونیم اور ڈھولک ضروری نہیں تھی، مزے کی بات یہ کہ اسے میلاد کی محفل میں نعت خوانی سے بھی یہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی، وہ پہروں روتا رہتا اور پھر بے ہوش ہو جاتا تھا۔"(۳)

احسان دانش چونکہ خود بھی مزدور تھے اور آپ کو اِسی وجہ سے شاعرِ مزدور بھی کہا جاتا ہے لہٰذا اُن کی مزدوروں کے ساتھ علیک سلیک بھی زیادہ تھی اور بقول محمد وارث کے آپ کا شجرہ نسب شیخ حسن رنجانی سے ملتا ہے اور شیخ کا سلسلہ حضرت ابو بکر صدیق سے جا ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احسان دانش نے میرٹھ والے درزی کا خاکہ بڑے خوبصورت انداز میں قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ کہ کس طرح ایک عام سا درزی مزدور دن بھر مزدوری کرنے کے بعد عشقِ الٰہی میں اپنی راتیں گزارتا تھا۔ میلادوں میں شرکت کرتا تھا پھر بعد میں صوفیاء جیسی حالت ہوئی پھر حال کی کیفیت میں چلا جاتا اور پہروں رونے کے بعد آخر کار بے ہوش ہو جاتا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو خاکے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اس میں سیرت و کردار کی صحیح اور جامع تصویر لکھاری مرتب کرے تو درج بالا تعریف خاکے کے اصول پر پورا اُترتی ہے۔ مصنف ایک اور جگہ پر پروفیسر منیر الدین منیر چغتائی کے معمولات و ترجیحات کے حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں:

"منیر چغتائی کو میں نویں جماعت سے دیکھ رہا ہوں وہ آکسفورڈ سے ڈی فل کر کے آئے اور تقریباً پانچ برس انگلستان میں رہے لیکن انہوں نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا اور اپنی اسلامی تہذیب کے دامن کو داغ دھبے سے پاک و صاف رکھا، وہ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ حافظ قرآن بھی ہیں اور پنجاب یونیورسٹی میں سیاسیات پڑھاتے ہیں۔"(۴)

مذکورہ پیراگراف میں پروفیسر منیر الدین منیر چغتائی کے معمولات و ترجیحات کو مصنف نے قلمبند کیا ہے۔ پروفیسر صاحب شاعر اور نثر نگار دونوں حوالوں سے جانے جاتے ہیں۔ درج بالا اقتباس کی زبان عام فہم اور رواں ہے۔ مصنف بتاتے ہیں کہ ویسے تو پروفیسر صاحب آکسفورڈ سے ڈی فل کی ڈِگری لے کر آچکے ہیں مگر احسان دانش آپ کو زمانہ طالبِ علمی سے جانتے ہیں جب آپ نویں جماعت کے طالبِ علم تھے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ کس طرح پروفیسر صاحب نے اپنی معمولات و ترجیحات کو مدِ نظر رکھا ہوا ہے۔ پانچ برس اپنے ملک سے دور رہنے کے باوجود اپنی اسلامی تہذیب کے دامن پر داغ نہیں لگنے دیا اور شراب جیسی نحوست سے کس طرح دور رہے۔ آپ نے انگریزی تعلیم ضرور حاصل کی ہے مگر اُس کے ساتھ وہ حافظِ قران بھی ہیں۔ اب وہ پنجاب یونیورسٹی میں سیاسیات

پڑھا رہے ہیں۔ معمولات و ترجیحات کے حوالے سے مصنف ایک جگہ پر صلاح الدین صاحب کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں۔

> ”مجھے خوشی ہوئی کہ میں مشاعرے کے بہانے ایک ایسے آدمی سے ملا ہوں جو شراب کا بہت بڑا تاجر ہے مگر شراب کے خلاف لوگوں کو دس دس روپے دے کر جلوس نکالتا ہے اور شراب کے خلاف سلوگن لکھوا لکھوا کر سنیما میں سلائیڈ چلواتا ہے، نشے کے خلاف مختلف آبادیوں میں قد آدم پوسٹر لگوانا اِس کا مشغلہ ہے وہ شراب سے جس قدر کماتا ہے، اس سے کہیں زیادہ اس کے خلاف پروپیگنڈے میں صرف کر دیتا ہے۔ میرے خیال سے یہ بھی ایک جہاد ہے اور اس کے مشاغل عبادت کی صف میں آتے ہیں، میری نظر میں ایسے لوگوں کا بھی ایک مقام ہے۔“(۵)

درج بالا اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ صلاح الدین صاحب ایسے شخص ہیں جو ملک و قوم کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ مصنف کہتے ہیں کہ میں اس چیز کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ مشاعرے کے بہانے ایسے آدمی سے ملاقات ہوئی جو ہے تو شراب کا تاجر مگر چلتا اس کے برعکس جتنا وہ اپنے کاروبار سے کماتا ہے اس سے زیادہ وہ اس چیز پر لگا دیتا ہے کہ اس کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ مصنف ایسے لوگوں کو نیک قرار دیتا ہے جو اِس طرح کے عمل کرتے ہیں۔ اور اس عمل کو جہاد کے مماثل قرار دیتا ہے۔ احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو دینی، سیاسی، علمی اور ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ مصنف مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کے معمولات و ترجیحات کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> ”میں نے جتنے بھی ثقہ علماء کو دیکھا ہے تحقیق کرنے پر انہیں مسجد کی روٹیوں سے بے نیاز پایا ہے۔ موصوف بھی انہی ثقات میں سے تھے جو کروشیے سے ٹوپیاں بُن کر اس کی آمدنی سے اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کیا کرتے تھے۔ تقوی اسے ہی کہتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی بات عقل سے پہلے دل کو متاثر کرتی ہے۔“(۶)

درج بالا اقتباس میں مصنف نے یہ بیان کیا ہے انہوں نے جتنے بھی با اعتماد یا قابل اعتماد علماء کو دیکھا۔ تحقیق ہونے پر اِن کو مسجد کی روٹیوں سے بے نیاز پایا۔ مصنف کہتے ہیں کہ مولانا مفتی کفایت اللہ کا شمار بھی انہی لوگوں میں سے ہوتا ہے۔ آپ کا معمول یہ تھا کہ کروشیے سے ٹوپیاں بنا کر اس کی آمدنی سے اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرتے تھے۔ محنت اور تقوی بھی اسی چیز کا نام ہے اور انہی لوگوں کی بات عقل سے زیادہ دل کو متاثر کرتی ہے۔ مصنف نے عام فہم اور رواں زبان کا استعمال کر کے مولانا مفتی کفایت اللہ کا تذکرہ بیان کر دیا ہے جس میں مفتی کفایت اللہ دہلوی

کے معمولات و ترجیحات سامنے آتے ہیں۔ "جہانِ دِگر" میں مفتی جمیل احمد کا بھی تذکرہ بیان ہوا ہے جس میں اُن کے معمولات پر معلومات ملتی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ:

"مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور سے فیضیاب ہیں وہی ایک عرصہ درس و تدریس میں منہمک رہے، تقسیم ملک کے بعد لاہور آ گئے اور جامعہ اشرفیہ میں مفتی کے عہدے پر فائز ہو گئے وہ فقہ بھی پڑھاتے ہیں اور حدیث بھی اور دونوں میں ان کا طرز کلام گنجلک نہیں ہوتا جہاں عقدہ ہوتا ہے وہی وہ اپنے طرز بیان سے شگفتگی اور اور سلجھاو پیدا کر دیتے ہیں محبت اور احترام کے قابل بزرگ ہیں۔"(۷)

مذکورہ اقتباس میں مصنف بتاتے ہیں کہ مفتی جمیل احمد نے مدرسہ مظاہر العلوم سے فیض حاصل کیا ہے اور وہاں پر ہی کافی عرصے سے درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہیں۔ جب تقسیم ہوئی تو آپ لاہور آ کر آباد ہو گئے۔ جامعہ اشرفیہ میں مفتی کے عہدے پر بھی رہ چکے ہیں۔ فقہ و حدیث دونوں پڑھاتے ہیں۔ آپ کی تحریر پر اگر کوئی پیچیدہ بات آ جاتی ہے تو اُسے شگفتگی سے سلجھا دیتے ہیں۔ آپ محبت اور احترام کے قابل شخص ہیں۔

احسان دانش نے ساغر صدیقی کا بھی تذکرہ قلم بند کیا ہے۔ اور اُن کے اِس تذکرے میں معمولات و ترجیحات کے حوالے سے معلومات ملتی ہے۔ مصنف ساغر صدیقی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ساغر صدیقی فطری شاعر تھا اور وقت کی آواز سے آواز ملا کر نغمے الاپتا تھا، اُس کے قدر شناسوں کی بھیڑ اور شاعروں کی داد و تحسین نے اسے گھر کا نہیں رکھا تھا، وہ شانہ سازی کا نہایت اچھا کاریگر تھا، مگر تماشائیوں کی واہ واہ اور بچونگڑوں کی داد و تحسین نے اسے گم کردہ راہ کر دیا تھا۔ اُس میں نشے کی خامی پختہ ہو گئی تھی اور اُس نے اُسے گداگری پر لا اُتارا تھا۔ لیکن اُس کا سوال ضرورت سے آگے نہیں تھا، وہ پسِ انداز کرنا حرام خیال کرتا تھا جو بڑے درویشوں کا خاصہ ہے، جب اس کے کیسہ میں پیسہ ہوتا تو اُس کے ناخنوں میں سوئیاں چبھتی رہتی اور وہ جس قدر جلدی ہو سکتا صرف کر ڈالتا۔۔۔"(۸)

درج بالا اقتباس میں مصنف نے ساغر صدیقی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ وہ فطری شاعر تھے۔ اُن کے قدر شناسوں نے ان کو داد دے دے کر اُنہیں کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ لٰہذا وہ راستے سے بھٹک گئے تھے نشہ اُن کے معمولات میں شامل ہو گیا تھا اور آہستہ آہستہ نشہ ترجیحات میں شامل ہو گیا۔ اور اس نشے کی وجہ سے وہ گداگری کی نوبت تک پہنچ گئے۔ مگر وہ اتنا ہی طلب کرتے تھے جتنی اُن کی ضرورت ہوتی تھی اگر اُن کے پاس پیسے آ جاتے تو اُن کو چین نہیں آتا تھا اور جلد از جلد اس کو ختم کر کے ہی دم لیتے تھے۔

احسان دانش نے جاوید حیات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ابتدا میں جاوید حیات کے حُلیے کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ اُس کے بعد وہ معمولات و ترجیحات پر آ جاتے ہیں۔ اِس حوالے سے احسان دانش لکھتے ہیں:

"وہ یوں تو نہایت ہشاش بشاش معلوم ہوتے ہیں، لیکن کبھی کبھی گفتگو کے بعض پڑاؤ پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے اَندر کا انسان تنہائی سے بیزار ہو کر کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہے، ایک عرصہ ہو گیا اُن کا یہ معمول ہے کہ وہ جمعرات کو میرے یہاں آتے ہیں اور جمعہ کی صبح کو اپنے مکان حافظ آباد چلے جاتے ہیں، وہ جتنے عرصے غریب کھانے پر رہتے ہیں دل اُن کی عقیدت کے مزے لے لے کر ہلکان ہوتا رہتا ہے۔"(۹)

مذکورہ اقتباس میں مصنف نے جاوید حیات کے معمولات پر بات کی ہے اِس کے لیے وہ اُن کے نقوش یعنی حُلیہ بتانے کے بعد اُن کی گفتگو کا انداز بتاتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ بیان کرتے ہیں کہ اُن کا یہ معمول ہے کہ وہ جمعرات کو مصنف کے پاس آتے ہیں اور جمعہ کی صبح اپنے مکان یعنی حافظ آباد چلے جاتے ہیں۔ مصنف نے اِس پیراگراف میں جاوید حیات سے اپنی عقیدت کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ جب مصنف کے پاس ٹھہرتے ہیں تو کیسے اُن کا دل عقیدت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ عام فہم الفاظ میں مصنف نے جاوید حیات کے معمولات پر بحث کی ہے۔

احسان دانش نے " جہانِ دِگر" میں احمد خاں کا بھی ذِکر کیا ہے۔ احمد خاں آرٹسٹ ہیں اور اِس کتاب میں مصنف نے آرٹسٹ کے حوالے سے جن لوگوں کو موضوع بحث بنایا ہے اور اپنی اس کتاب میں آرٹسٹ کا جو عُنوان دیا ہے اُس میں احمد خان کو بھی شامل کیا ہے۔ احمد خان کے اِس تذکرے میں معمولات و ترجیحات پر معلومات ملتی ہے مصنف کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"احمد خان آرٹسٹ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، آج وہ نیشنل کالج اف آرٹس لاہور میں اُستاد ہے، اُس نے اپنی تعلیم میرے غریب خانے پر مکمل کی ہے اور کمرشل آرٹ میں کسی کو اپنا مقام چھونے نہیں دیتا، اس شعبے کے اساتذہ میں اس کا نام ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس نے تحصیل فن میں برسوں اپنا خون پانی ایک کر رکھا تھا۔ اُس کی ابتدائی مشق کا کاغذوں کا ڈھیر ابھی تک میرے یہاں پر پڑا ہے، جس سے اُس کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے مگر اب آ کر اُس میں ایک بے پرواہی آ گئی ہے جو صاحب کمال لوگوں کا خاصہ ہے۔ لیکن میں اِس بات کو اچھی علامت خیال نہیں کرتا، صاحبِ کمال ہو کر تو آدمی کو سچا، حلیم بردبادانتھک اور انسانیت کا علم بردار ہو جانا چاہیے! (۱۰)

مصنف نے اِس اقتباس میں احمد خان جو کہ آرٹسٹ ہیں کے معمولات پر تبصرہ کیا ہے۔ اُن کا ماننا ہے کہ وہ اپنے فن کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ اُن کے معمولات میں یہ بات شامل ہے کہ وہ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور میں استاد ہیں۔ تعلیم تو انہوں نے احسان دانش کے گھر میں رہ کر حاصل کی ہے۔ اور اِس قدر اپنا مقام بنایا ہے کہ اپنے شعبے میں وہ اَب کسی کو وہ مقام چھونے نہیں دیتے۔ اِس کے پیچھے اُن کی محنت شامل ہے۔ اور وہ

ابتدائی مشق جو اُن کے معمولات میں شامل تھی اُس کا ثبوت یعنی کہ وہ صفحات جس پر وہ مشق کرتے تھے ابھی تک وہ احسان دانش نے سنبھال رکھے ہیں۔ مگر اب وہ بے پروائی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ مصنف اِس بات کو اچھا تصور نہیں کرتے۔ مصنف کے مطابق جب اِنسان صاحب کمال ہوتا ہے تو اس آدمی کو سچا اور سخت محنت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کیونکہ ایسا شخص انسانیت کا علمبر دار ہو جاتا ہے۔ اِس تذکرے میں بھی عام فہم اور روزمرہ کے الفاظ کا استعمال ملتا ہے جس سے با آسانی قاری احمد خان کے معمولات و ترجیحات سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے اور احمد خان کو بھی با آسانی سمجھ سکتا ہے۔ مصنف نے بطور آرٹسٹ احمد خان کے کردار کو بخوبی سمجھا پرکھا اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ قاری کے سامنے بیان کر دیا ہے۔

احسان دانش نے " جہانِ دِگر" میں دلاور فگار کا بھی تذکرہ بیان کیا ہے۔ اور اُن کے اِس تذکرے میں معمولات و ترجیحات کے حوالے سے مواد مل جاتا ہے۔ احسان دانش بیان کرتے ہیں:

> " دلاور فگار کو میں ایک عرصے سے جانتا ہوں، میں نے مزاح نگاروں کو عموماً ایسا دیکھا ہے کہ اُن کی زندگی حرکات و سکنات میں بھی ایک طرح کی مسخرگی آجاتی ہے لیکن دلاور فگار میں یہ بات نہیں، وہ صرف اسٹیج تک مزاح کے آدمی ہیں اور اسٹیج سے اُتر کر قاعدے کے انسان وہ کراچی میں مقبول تو ہیں لیکن شہرت اور مقبولیت کی چکیاں ابھی کچی ہیں۔"(۱۱)

درج بالا اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے بڑی باریک بینی کے ساتھ شخصیات کو پرکھا ہے پھر ان کا تذکرہ بیان کیا ہے۔ جس طرح انہوں نے دلاور فگار کی تصویری البم ہمارے سامنے بنا دی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اُنہوں نے جس طرح دلاور فگار کے معمولات و ترجیحات کو قلم بند کیا ہے وہ قاری کو اُس نہج پر لے جاتے ہیں جس سے قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلاور فگار کے ساتھ موجود ہے اور اُن کی معمولات کو بغور اپنی انکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ وہ دلاور فگار کو ایک عرصے سے جانتے ہیں اور مصنف کا یہ ماننا ہے کہ عموماً مزاح نگار ایسے ہوتے ہیں جن کی حرکات و سکنات میں مسخرگی آجاتی ہے مگر دلاور فگار ایسے نہیں۔ وہ صرف اسٹیج تک مزاح کے آدمی ہیں اسٹیج سے اُترتے ہی وہ قاعدے کے انسان بن جاتے ہیں۔ کراچی میں اُنہوں نے مقبولیت حاصل کی ہے مگر یہ شہرت ابھی کچی ہے۔ مصنف نے بڑی مہارت کے ساتھ دلاور فگار کے معمولات و ترجیحات کا نقشہ کھینچ کر قاری کے سامنے رکھ دیا ہے اور ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جس سے قاری کو کسی قسم کی دِقت نہیں ہوتی۔

ب۔ طرزِ نشست و برخاست:

خاکہ نگاری کا ایک اہم عُنصر طرزِ نشست و برخاست ہے۔ شخصیت کو سمجھنے کے لیے خاکہ نگاری میں یہ عناصر بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اِسی عناصر کے ذریعے کسی شخص کو حقیقی طور پر پہچانا جا سکتا ہے۔ جس طرح خاکے

میں دیگر لوازمات اور مقاصد کو مدِ نظر نظر رکھا جاتا ہے اور اِس سے شخصیت کی صحیح عکاسی ہو سکتی ہے ویسے ہی طرزِ نشست و برخاست کے ذریعے شخصیت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے ۔اِس عناصر کے ذریعے صاحبِ خاکہ کی مکمل تصویر واضح ہو کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ شخصیت کیسی ہے ؟اُس کے اُٹھنے بیٹھنے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ خاکہ نگار کے لیے یہ فن مشکل ضرور رہا ہے مگر ایک اچھا خاکہ نگار وہی ہو سکتا ہے جو صاحبِ خاکہ کی مکمل تصویر اِس طرح کھینچ کر ہمارے سامنے رکھ دے کہ وہ شخصیت ہمارے سامنے متحرک صورت میں آ جائے۔ دَراصل خاکہ نگار کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ شخصیات کا مکمل نقشہ کھینچ کر قاری کے سامنے رکھ دے۔ احمد ندیم قاسی لکھتے ہیں:

> ”بعض خاکے کسی شخصیت کے ایک پہلو کے بارے میں ہوتے ہیں پوری شخصیت سامنے نہیں آتی اور جب تک پوری شخصیت سامنے نہ لائے تو اُسے خاکہ کہنا زیادتی ہوگا۔“(۱۲)

درج بالا تعریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شخصیت کے صرف ایک پہلو پر ہی بات نہیں ہوتی اِس کو سمجھنے کے لیے اور شخصیت کو مکمل طور پر قاری کے سامنے لانے کے لیے شخصیت کے تمام پہلوؤں کو مدِ نظر رکھنا چاہیے تاکہ صاحبِ خاکہ کی مکمل اور محترک صورت قاری کے سامنے لائی جاسکے اِس لیے خاکہ نگار کو خاکہ نگاری کے اِس اہم عُنصر کی طرف توجہ ضرور دینی چاہیے۔ تاکہ قاری مکمل شخصیت سے حِظ اُٹھاسکے۔ طرزِ نشست و برخاست ہی وہ اہم عناصر ہے جس میں صاحبِ خاکہ اگر اپنے بارے میں کچھ چھپانا بھی چاہے تو خاکہ نگار اپنے عمیق مطالعے اور گہرے تعلقات کی بنا پر صاحبِ خاکہ کا نقشہ لفظوں میں ایسے کھینچ کر رکھ دے کہ ایک عام قاری صاحبِ خاکہ کے بارے میں وہ تمام معلومات حاصل کر سکے جو اس کی نظروں سے اُوجھل تھی۔

"جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے جن شخصیات کے تذکرے بیان کیے ہیں اُن میں خاکے کے باقی عناصر کی طرح طرزِ نشست و برخاست کے حوالے سے بھی معلومات مل جاتی ہے جس سے صاحبِ خاکہ کی شخصیت کو با آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً رابعہ نہاں کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں کہ:

> ”رابعہ نہاں کو میں نے مشاعروں میں بھی سنا ہے اور نجی نشستوں میں بھی دیکھا ہے ان کی متانت میں کہیں درز نہیں کھلتی، اور معلوم ہوتا ہے کہ شعر کے مفہوم اور رابعہ نہاں کے دل میں گہرا ربط ہے۔“(۱۳)

رابعہ نہاں آگرہ سے تعلق رکھنے والی ایک شریف شاعرہ ہے۔ مصنف نے اس اقتباس میں اُن کی شاعری کے حوالے سے تذکرہ کیا ہے کہ اُنھوں نے رابعہ نہاں کو مشاعروں میں اور نجی نشستوں میں دیکھا اور سنا ہے۔ اُن کی زبان سے کبھی بے ہودہ الفاظ نہیں نکلے۔ شعری حوالے سے اُن کے ہاں کافی پختگی ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے شعر کے مفہوم اور رابعہ نہاں کے دِل میں گہرا ربط ہے۔

احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں سعیدہ عروج مظہر کا بھی تذکرہ بیان کیا ہے۔ اور اِن کے اِس تذکرے میں خاکے کے اہم عُنصر نشست و برخاست پر بھی معلومات ملتی ہے۔ سعیدہ عروج مظہر بھی شاعرہ ہیں۔ احسان دانش سعیدہ عروج مظہر مظہر کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔

"سعیدہ شعبہ تعلیمات سے منسلک ہیں میں ایک مدت سے انھیں سنتا آرہا ہوں اور جب بھی سنتا ہوں ان کے جذبے اور لہجے میں اضمحلال نہیں پاتا، یہ اپنی عمر کے ساتھ فن میں ترقی کرتی جارہی ہیں، کہیں کہیں تو ان کے اشعار ان کے متعلق سوچتے رہنے کا مطالبہ کرتے ہیں، یہ سیدھی سادی اور خلیق کے علاوہ مخلص خاتون ہیں، جنہیں مجلسوں میں بھیٹنے کے ساتھ مجلس آرائی کا سلیقہ بھی ہے اور آداب حیات بھی ملحوظ رکھتی ہیں۔"(۱۴)

مذکورہ اقتباس میں مصنف نے سعیدہ عروج مظہر کا تذکرہ بیان کرتے ہوئے اُن کی محفل میں شرکت یعنی طرزِ نشست پر بات کی ہے سب سے پہلے مصنف سعیدہ عروج کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ شعبہ تعلیم سے منسلک ہیں اور احسان دانش اُن کو کافی عرصے سے سن رہے ہیں۔ جب بھی احسان دانش نے ان کے اشعار سنے ہیں ان کے جذبے اور لہجے میں تھکن یا سستی نظر نہیں آئی مزید یہ اپنی بڑھتی عمر کے ساتھ اپنے فن میں مزید ترقی کرتی جارہی ہیں۔ بعض اشعار تو اُن کے اتنے اچھے ہیں کہ اُن کے بارے میں سوچنے کا موجب بنے رہتے ہیں۔ مصنف مزید اُن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ سیدھی سادی اور خلیق قسم کی خاتون ہیں آپ مجلس میں رونق کا باعث بھی بنتی ہیں اس کے علاوہ زندگی جینے کا ہنر بھی آپ کو معلوم ہے۔ درج بالا اقتباس میں عام فہم الفاظ میں احسان دانش نے سعیدہ عروج مظہر کی شخصیت اور اُن کی بزم آرائی پر بات کردی ہے جس سے اُن کی شخصیت واضح ہو کر قاری کے سامنے آ رہی ہے۔

احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں بیگم طیبہ محسن کا بھی تذکرہ بیان کیا ہے بیگم طیبہ محسن بھی شاعرہ ہیں اور اُن کے اِس تذکرے میں خاکے کے اہم عُنصر نشست و برخاست پر معلومات ملتی ہے۔ جس سے بیگم طیبہ محسن کی شخصیت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔ جس سے قاری بیگم طیبہ محسن کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

"ان کی اہلیہ طیبہ محسن صاحبہ پڑھی لکھی اور سلیقہ مند خاتون ہیں، انہیں بھی شعر و ادب کا ذوق کم نہیں۔ آئے دن وہ اپنے یہاں ادبی نشستیں برپا رکھتی ہیں، ان کا رجحان زیادہ حمد و نعت کی طرف ہے جو عموماً شریف اور خاندانی عورتوں کا شعار ہوتا ہے۔ ان کا یہ ذوق بتاتا ہے کہ ان کی تربیت کسی نہایت شریف اور متقی گھرانے میں ہوئی ہے وہ کفر الحاد کے خیالات سے کوسوں دور ہی پیغمبر خدا کے اسوہ حسنہ کو زندگی کی شاہراہ خیال کرتی ہیں، قومی اور سیاسی

خدمات میں وہ اپنے شوہر کے دوش بدوش کام کرتی ہیں۔غالباً اس لیے کہ اسلام نے شوہر کو خدا سے دوسرا درجہ دیا ہے یہی سبب ہے کہ طیبہ نے اپنے شوہر کی تیوری پر بَل دیکھا تو اپنے شعر و ادب کے فطری ذوق سے بھی دستبردار ہو گئیں۔"(۱۵)

درج بالا اقتباس میں اہلیہ طیبہ محسن کی طرز نشست و برخاست پر مواد میسر آتا ہے۔ جس سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ آپ پڑھی لکھی خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ سلیقے والی خاتون بھی ہیں۔چونکہ آپ شاعرہ ہیں اس لیے انہیں شعر و ادب کا بڑا ذوق ہے۔اسی وجہ سے آپ کے ہاں نشستوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مگر ان میں زیادہ تر رجحان حمد و نعت کی طرف ہوتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہب کی کس طرح پیروکار ہیں۔اور کیسے ان کی تربیت کسی اچھے خاندان میں ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ کفر سے کوسوں دور ہیں اور پیغمبرِ خدا کے راستے پر چلنے کو ہی سیدھا راستہ سمجھتی ہیں۔ اپنے شوہر کی طرح قومی و سیاسی خدمات سر انجام دیتی ہیں اور شوہر کو خدا کے بعد دوسرے درجے پر سمجھتی ہیں۔ اِسی سبب جب شوہر کے ماتھے پر شکن یا تیوری دیکھی تو شعر و ادب جو کہ فطری ذوق ہوتا ہے جیسی نشست کو برخاست کر دیا اور اس سے دستبردار ہو گئی۔اس تذکرے میں اہلیہ طیبہ محسن کی طرز نشست و برخاست سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ مذہب سے گہرا لگاؤ رکھنے والی خاتون تھی اور اپنے شوہر کو بھی حد سے زیادہ چاہتی تھی۔ لہٰذا شوہر کے بل پر تیوری دیکھ کر شعر و ادب کو چھوڑ دیتی ہیں۔ مصنف نے آپ کے واقعات کے استعمال میں جزئیات نگاری سے کام لیا ہے اسی وجہ سے طیبہ محسن کی تصویر مکمل طور پر قاری کے سامنے عیاں ہو جاتی ہے۔

احسان دانش نے " جہانِ دِگر" میں جمیلہ ہاشمی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی وجہ شہرت بطور افسانہ نگاری ہے اور اس حوالے سے وہ ادبی دنیا میں شہرت رکھتی ہیں۔ مصنف جمیلہ ہاشمی کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

"ادبی قسم کی نشستوں میں بھی وہ شریک ہوتی ہیں اور اپنی عادت کے مطابق حق گوئی سے بھی نہیں چوکتیں"(۱۶)

جمیلہ ہاشمی کے حوالے سے بیان کیا گیا یہ تذکرہ اختصار پر مبنی ہے۔یہی وصف خاکے کو سوانح سے ممتاز کرتا ہے اس تذکرے میں مصنف جمیلہ ہاشمی کی ادبی نشستوں میں شرکت کے حوالے سے معلومات دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب سے لگاؤ رکھتی ہیں نہ صرف ادبی نشستوں میں شرکت کرتی ہیں بلکہ سچ کہنے سے بھی نہیں چوکتی۔یہی چیز ان کو باقی لوگوں سے ممتاز بھی کرتی ہے۔ مصنف نے عام فہم الفاظ کے ذریعے جمیلہ ہاشمی کی نشستوں میں شرکت قاری کے سامنے بیان کر دی ہے۔

" جہانِ دِگر" میں بیگم فیضان پر بھی تذکرہ کیا گیا ہے اور ان کے اس تذکرے میں طرز نشستوں و برخاست پر بھی بات کی گئی ہے۔ مصنف اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"میری کتاب "جہانِ دانش" پر جناب پروفیسر عاصی کرنالی نے ایک نشست خصوص کی تو مجھے ملتان جانا پڑا۔۔۔اسی نشست کے سلسلے میں بیگم فیضان سے بھی ملاقات ہوئی، فیضان صاحب ملتان کے مشہور وکلاء میں ایک خاص حثیت اور مقام کے مالک ہیں اور ان کی یہ عظمت صرف وکالت کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ اور ان کی بیگم قومی خدمات کے سلسلے میں مخلص اور محنتی کارکن مشہور ہیں۔۔۔میں جناب اسی کرنلی کا مہمان تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی کوٹھی پر ایک علمی ادبی نشست کا اہتمام کیا اور اس میں صرف شعراء و ادباء ہی کو نہیں بلایا بلکہ شہر کے معززین کو مدعو کیا اور شام پڑھے یہ نشست اختتام تک پہنچی اور لوگ سبزہ زار پر چائے کے دوران فیضان اور بیگم فیضان کے اخلاق مروت اور ذوق کی ثناخوانی کرتے رہے۔"(۱۷)

اس اقتباس میں بیگم فیضان کے طرزِ نشست و برخاست پر معلومات ملتی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ عاصی کرنالی نے جب نشست مخصوص کی تو اِسی سلسلے میں مصنف کو بھی ملتان کا دورہ کرنا پڑا وہی پر مصنف کی بیگم فیضان سے ملاقات ہوئی ہے جو وکالت کی وجہ سے بڑا مقام رکھتی ہیں۔ نہ صرف وکالت بلکہ وہ قومی خدمات کے حوالے سے بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ بڑی محنتی خاتون ہیں۔ مصنف عاصی کرنالی کے مہمان تھے اِس کے باوجود اُنھوں نے مصنف کو اپنی کوٹھی پر بلایا اور ایک علمی ادبی نشست کا اہتمام کرایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنی بڑی علمی شخصیت اور علمی شخصیات کی پُرستار تھی۔ اُنھوں نے شعراءوادباء کے علاوہ شہر کے معززین کو بھی دعوت دی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف اُن کی شعراء و ادباء بلکہ معززینِ شہر سے بھی علیک سلیک اچھی تھی۔ یہ نشست کافی وقت رہی اور شام کے وقت جا کر کئی برخاست ہوئی۔ نشست کے بعد لوگ جب چائے پر بھیٹے تو اُنھوں نے اِس نشست اور بیگم فیضان کے اخلاق اور ذوق کی تعریف کی۔ اِس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذوق والی خاتون تھی اور دوسری علمی شخصیات سے کس حد تک متاثر تھیں۔ اِس نشست و برخاست کے تذکرے سے بیگم فیضان کے ادبی ذوق اور اُن کے لوگوں کے ساتھ برتاؤ کی مکمل تصویر قاری کے سامنے واضح ہو جاتی ہے۔ احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں شاعرات کے حوالے سے جو عنوان قائم کیا ہے اُس میں حسنہ بیگم کا بھی نام آتا ہے۔ حسنہ بیگم کے تذکرے میں خاکے کے اہم عُنصر نشست پر بھی معلومات مل جاتی ہے۔ مصنف حسنہ بیگم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بیگم حسنہ لقمان حیدر مرحوم کی اہلیہ ہیں، تعلیمی اعتبار سے تو وہ ایم اے علیگ ہیں اور ایک کالج میں لیکچرر بھی ہیں، لیکن جہاں تک شعر و ادب کا تعلق ہے وہ نہایت اچھا شعر کہتی ہیں یہ اور بات ہے کہ وہ مشاعروں میں شعر سنانے کی عادی نہیں، نجی نشستوں میں کبھی کبھی ان کا سکوت ٹوٹتا ہے اس کے علاوہ وہ نہایت چابک آرٹسٹ بھی ہیں۔"(۱۸)

بیگم حسنہ پر لکھا گیا یہ تذکرہ بھی اختصار پر مبنی ہے۔ مگر اِس تذکرے میں خاکے کے عُنصر نشست وبرخاست پر بھی بات ہوئی ہے۔ ویسے تو اختصار بھی خاکے کا عُنصر ہے مگر اِس تذکرے میں نشست و برخاست کے حوالے سے درج کی گئی معلومات پر مواد مل جاتا ہے۔ بیگم حسنہ لقمان حیدر مرحوم کی زوجہ ہیں۔ تعلیمی حوالے سے وہ ایم اے علیگ ہیں۔ احسان دانش نے بیگم حسنہ کے اِس تذکرے میں علیگ کی اصطلاح استعمال کی ہے ۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علی گڑھ کالج سے فارغ التحصیل ہیں۔ دراصل یہ اصطلاح علی گڑھ کالج کے طالب علموں کے لیے ہی استعمال کی جاتی ہے۔ اوراس اصطلاح کے ذریعے طالبِ علم علی گڑھ کالج کا طالبِ علم رہنے پر فخر اور ناز محسوس کرتا ہے۔ بیگم حسنہ ایک کالج میں لیکچر بھی ہیں۔ اِن کے شعر و ادب کے حوالے سے مصنف بیان کرتے ہیں کہ وہ اچھا شعر کہتی ہیں اور وہ مشاعروں میں شعر نہیں سناتی۔ کیونکہ انھیں اِس چیز کی عادت نہیں۔ البتہ نجی نشستوں میں بعض اوقات اِن کا سکوت ٹوٹتا ہے اور اشعار سنا دیتی ہیں۔ اِس کے علاوہ وہ اچھی آرٹسٹ بھی ہیں۔ مصنف نے عام فہم الفاظ کے ذریعے حسنہ بیگم کا نقشہ قاری کے سامنے کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

احسان دانش نے ثاقب لکھنوی کا بھی "جہانِ دِگر" تذکرہ بیان کیا ہے۔ ثاقب لکھنوی لکھنؤ کے بزرگان میں سے ہیں۔ شاعر ہیں۔ اِن کا تذکرہ بیان کرتے ہوئے احسان دانش نے جن الفاظ کا استعمال کیا ہے اُس میں طرزِ نشست کے حوالے سے معلومات ملتی ہے۔ مثلاً اس بارے میں بیان کرتے ہیں۔

> ''میں جناب ثاقب سے کئی بار ملا ہوں اور مجھ پر خصوصی کرم فرماتے تھے ایک بات انھوں نے سر سلطان احمد کے یہاں میری ایک نظم "طوفانی نغمہ" سنی تو بہت متاثر ہوتے اور ایک دوسری نشست میں انہی کے یہاں مجھے اسی قسم کی ایک طوفانی نظم سنائی اور فرمایا اس نظم کا جذبہ آپ کی نظم سے ملا تھا اور میں خصوصیت سے یہ نظم آپ کو سنانا چاہتا تھا۔''(۱۹)

درج بالا اقتباس میں مصنف بتاتے ہیں کہ اُن کی ملاقات جناب ثاقب سے کافی دفعہ ہوئی ہے۔ اور مصنف پر خصوصی کرم فرماتے ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے سر سلطان احمد کے ہاں نشست میں نظم طوفانی نغمہ احسان دانش سے سُنی۔ چونکہ احسان دانش شاعر بھی تھے لہذا نشستوں میں آپ شاعری سنایا کرتے تھے۔ وہاں سے جناب ثاقب کو جذبہ ملتا ہے اور تخیل میں یہ بات محفوظ رہتی ہے جس وجہ سے وہ بھی اسی طرح کی نظم لکھتے ہیں ایک اور نشست میں اپنی وہ طوفانی قسم کی نظم سناتے ہیں جس کا عنوان تذکرے میں درج نہیں کیا گیا اور احسان دانش کو بتاتے ہیں کہ یہ نظم انہوں نے اُن سے جذبہ لینے کے بعد لکھی ہے اور خصوصی طور پر احسان دانش کو سنانا چاہتے تھے۔ اِس تبصرے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایسی نشستیں جس میں شاعر حضرات مل بیٹھتے ہیں اشعار سُناتے ہیں وہی پر ایک

دوسرے کے خیالات سے جذبہ لیتے ہیں اور اُسی طرح کی شاعری کرتے ہیں جس سے اَدب کو مزید فروغ ملتا ہے۔ اور شاعر بھی ایک دوسرے کے نظریات سے متاثر ہوتے ہیں۔ احسان دانش نے عام فہم الفاظ میں جناب ثاقب کا تذکرہ قلم بند کر دیا ہے جس میں طرزِ نشست وبرخاست اور اِس سے ملنے والے فائدے پر بات کی ہے۔

احسان دانش نے مرزا حیدر بیگ کا تذکرہ بھی بیان کیا ہے۔ آپ کی وجہ شہرت شاعری ہے۔ شاعری میں آپ کی پسندیدہ صنف غزل ہے۔ احسان دانش کے بیان کیے گئے اِس تذکرے میں خاکے کے اہم عناصر طرزِ نشست پر بھی معلومات ملتی ہے۔ احسان دانش لکھتے ہیں: ”مرزا حیدر بیگ سے بمبئی میں تعارف ہوا وہ وہاں طبیب تھے اور اُن کے یہاں اکثر اہل علم وادب کی نشستیں رہتی تھیں۔“[۲۰]

مذکورہ اقتباس میں مصنف نے عام فہم الفاظ کا استعمال کیا ہے جس میں انہوں نے مرزا حیدر بیگ سے اپنے تعارف کا ذکر کیا ہے جو ان کا بمبئی میں ہوا تھا۔ مصنف لکھتے ہیں کہ آپ وہاں پر طبیب تھے اِس کے علاوہ آپ کے ہاں اہلِ علم وادب کی نشستیں رہتی تھیں۔ اِس سے پتا چلتا ہے کہ آپ کا ذوق کس طرح تھا آپ چونکہ خود بھی شاعر تھے لہٰذا اہل علم و ادب کی قدر کرتے تھے اور اُن کو اپنے یہاں مدعو کرتے تھے۔ اور پھر نشستیں چلتی تھیں جس میں مختلف موضوعات پر شاعری اور علم وادب کے مختلف موضوعات پر بحث ہوتی تھی۔ اِس مختصر تذکرے میں مصنف نے مرزا حیدر بیگ کی صحیح عکاسی بیان کر دی ہے جس سے مرزا حیدر بیگ کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے قاری کو کافی سہولت میسر آتی ہے۔

احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں حمیدہ سلطان کا بھی تذکرہ بیان کیا ہے۔ اِس کتاب میں مصنف نے جو "اساتذہ پنجاب یونیورسٹی اور دیگر معلمین" کا عُنوان دیا ہے اُس میں حمیدہ سلطان کا تذکرہ شامل ہے۔ اِس تذکرے میں خاکے کے اہم عُنصر پر بھی معلومات مل جاتی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> ”حمیدہ سلطان سے دہلی میں ملاقات ہوئی میں ان کے یہاں ایک ادبی نشست میں بھی شریک ہوا۔ جس میں الٰہ آباد سے جناب فراق بھی تشریف لائے ہوئے تھے اس کے بعد لاہور میں بھی ایک نشست میں ملاقات ہوئی۔ وہ ایک مہذب اور تربیت یافتہ خاتون ہیں زبان تو خیر اُن کے گھر کی چیز ہوئی وہ قلم کے معاملے میں بھی بہت مضبوط ہیں۔“[۲۱]

اِس تذکرے میں مصنف نے حمیدہ سلطان سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ حمیدہ سلطان ادبی نشستوں کا بھی اہتمام کیا کرتی تھی۔ ایک نشست میں مصنف کا بھی حمیدہ سلطان کے ہاں جانا ہوا اور اس نشست میں الٰہ آباد سے جناب فراق بھی تشریف لائے تھے۔ فراق گورکھپوری کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی وجہ شہرت بطور مصنف، ادیب، نقاد اور شاعر کے ہے۔ آپ کا شمار بیسویں صدی کے صفِ اوّل کے بڑے شعراء میں ہوتا ہے۔ مصنف کی دوسری ملاقات حمیدہ سلطان سے لاہور میں ایک اور نشست میں ہوتی ہے۔ احسان دانش نے اِن دو

ملاقاتوں میں ہی حمیدہ سلطان کی شخصیت کو سمجھ اور پرکھ لیا۔ادبی نشستوں میں ادیبوں اور شاعروں کی جو ملاقاتیں ہوتی ہیں پھر مصنف جب اُن کا تذکرہ کرتے ہیں تو صاحبِ تذکرہ شخصیت کھل کر قاری کے سامنے آ جاتی ہے۔مصنف بیان کرتے ہیں کہ اِن نشستوں سے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کس طرح مہذب اور تربیت یافتہ خاتون ہیں۔ زبان میں بھی کافی مہارت رکھتی ہیں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ان کے گھر کی چیز ہو قلمی حوالے سے بھی مضبوط ہیں۔ مصنف نے عام فہم الفاظ کا استعمال کر کے حمیدہ سلطان کی شخصیت قاری کے سامنے واضح کر دی ہے جو ایک اچھے خاکہ نویس کے ہاں ہمیں نظر آتی ہے۔ مصنف نے شخصیت کی خوبیوں اور نشستوں کا تذکرہ ایسے الفاظ میں کیا ہے جس سے قاری بخوبی واقف ہو سکتا ہے۔احسان دانش نے پنڈت جیون لال شوق کا بھی تذکرہ کیا ہے۔اور اس کو بھی "اساتذہ پنجاب یونیورسٹی اور دیگر معلّمین" کی فہرست میں شامل کیا ہے۔اِس تذکرے میں خاکے کی اہم عناصر طرزِ نشست و برخاست پر معلومات ملتی ہے۔مصنف لکھتے ہیں:

> "تقسیم سے پہلے ہی میں شوق صاحب سے ملا ہوں وہ انگریز طرز کے افسرانہ مزاج رکھنے والے انسان ہیں۔ مشاعروں میں صدارت کے مستحق بھی سمجھے جاتے ہیں اور اپنا کلام بھی سناتے ہیں وہ جو کچھ پڑھتے ہیں وہ اصلاح کا محتاج نہیں ہوتا اور اس میں پختگی کے علاوہ مشق و مزاولت بھی جھلکتی ہے۔"(۲۲)

مذکورہ اقتباس میں عام فہم الفاظ استعمال کر کے پنڈت جیون لال شوق کا تذکرہ احسان دانش نے قاری کے سامنے بیان کر دیا ہے۔اِس تذکرے میں وہ تقسیم سے قبل ملاقات کا ذکر کرتے ہیں۔ تقسیم یعنی کہ پاکستان بننے سے قبل جب مصنف پنڈت جیون لال شوق سے ملے تو اُن کو پتہ چلا کہ وہ انگریزی طرز کے انسان ہیں اور انہی کی طرح افسرانہ مزاج بھی رکھتے ہیں۔اکثر نشستوں یا مشاعروں میں ان کو بطورِ صدارت بلایا جاتا ہے اور مصنف کے مطابق وہ اس کے مستحق بھی ہیں۔ان نشستوں میں وہ اپنا کلام بھی سناتے ہیں۔جو کچھ وہ پڑھتے ہیں وہ اصلاح کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ آپ کے کلام میں پختگی کے علاوہ آپ کی مشق بھی جھلکتی ہے۔ لہٰذا اس اقتباس سے طرزِ نشست و برخاست کے حوالے سے نہ صرف معلومات ملتی ہے بلکہ شخصیت بھی واضح ہوتی ہے۔اور قاری کو پتہ چلتا ہے کہ پنڈت جیون لال کا طرزِ رہن سہن کیا تھا اور مشاعروں میں کیسے کلام سُناتے تھے۔اِس کے علاوہ مشقی مہارتوں کی جھلک سے بھی شخصیت واضح ہوتی ہے۔

ج۔عادات واطوار:

عادات و اطوار کا مطلب ہے افراد یا جماعت کے طریقے اور روایات جو اِن کی روز مرہ زندگی کو متاثر کرتی ہے۔کوئی بھی شخص ہو جس طرح کا بھی ہو اُس کے بارے میں اگر کوئی رائے قائم کرنی ہے تو شخصیت کا محض ڈیل ڈول ہی نہیں دیکھا جاتا بلکہ اُس کے خاندانی پسِ منظر کے ساتھ ساتھ عادات و اطوار کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔

بعض اشخاص کی عادات سے ہی اُن کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ شخصیات کا اگر فہم و ادراک دیکھنا ہے تو اِس بات کا اندازہ بھی عادات و اطوار سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے وقار حسن گل کچھ یوں لکھتے ہیں:

"انسان تو سبھی ہیں۔ انسان اور انسان کے درمیان فرق بھی ہوتا ہے جو ظاہری بھی ہے اور باطنی بھی، انسان کی ظاہری اور باطنی خصوصیات مل کر اس شخصیت کی صورت گری کرتی ہیں۔ انسان کو مکمل حالت میں دیکھ لینا اور اس کو حقیقت پسندی کے ساتھ دل پذیر اور دلکش انداز میں تحریر کر دینا ہی خاکہ نگاری ہے۔"(۲۳)

درج بالا عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخصیت کے مطالعے میں عادات و اطوار کا سمجھنا اور جاننا بہت ضروری ہوتا ہے۔ عادات کے ذریعے ایک تو رائے قائم ہوتی ہے دوسرا اِس شخص کے بارے میں مثبت و منفی تصویر بھی سامنے آ جاتی ہے۔ شخصیت فہمی کے لیے عادات ہی ابتدائی سیڑھی کا کام دیتی ہیں۔ اور یہی دوسرے انسان کے لیے تمیز کی علامت بھی ہے۔

"بڑے آدمیوں کے اقوال میں جو ان کی بے تکلف گفتگو اور شراب نوشی کے عالم میں کہے گئے ہوں کچھ ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو آنے والی نسلوں کو منتقل کیے جانے کے قابل ہیں۔"(۲۴)

درج بالا اقتباس سے اس بات کا ادراک ہو جاتا ہے کہ جو باتیں یا پھر جو کام عام عادات کے ہوتے ہوئے سرزد ہو جاتے ہیں اور خاکہ نگار اُس معلومات تک پہنچ پاتا ہے تو اُس معلومات کے ذریعے جس شخصیت پر خاکہ لکھا گیا ہے کے حوالے سے بیش بہا قیمتی معلومات مہیا ہو سکتی ہے۔ جو عام قاری کی نظروں سے اُوجل ہوتے ہیں۔ ذیل میں ہم "جہانِ دِگر" میں خاکے کے اہم عناصر عادات و اطوار کا جائزہ لیتے ہیں۔ "جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے نواب ملک امیر محمد خان کا تذکرہ کیا ہے۔ جو سابق گورنر مغربی پاکستان بھی رہ چکے ہیں۔ ویسے تو آپ کی شخصیت میں گونا گوں خصوصیات موجود ہیں مگر احسان دانش کے اِس تذکرے سے اُن کے عادات و اطوار کا احوال معلوم ہوتا ہے۔

"وہ ایک شیر دل اور بے خوف انسان کے علاوہ مردانہ کھیلوں کے شائق تھے۔ وہ فیاض غریب پرور رئیس کے علاوہ صاف گو انسان تھے۔ وہ سیاست دان بھی تھے اور صدق گو مسلمان بھی۔ اُن کی تعلیمی قابلیت اور ذہانت اب تک زبانِ زدِ خلائق ہے اُن کی طبیعت اور عادات و خصائل سادہ اور باقاعدہ تھے۔"(۲۵)

درج بالا اقتباس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصنف نے غیر جانبداری کا سہارا لیا ہے۔ جس طرح اُنھوں نے شخصیت کو دیکھا ویسا بیان کر دیا۔ اِس اقتباس میں مصنف بتاتے ہیں کہ نواب صاحب کتنے بہادر انسان تھے۔ اور کھیلوں کے شوقین تھے۔ اُن کی قابلیت اور ذہانت کا ہر شخص معترف تھا۔ اُن کی عادات اور طبیعت میں سادگی تھی اور وہ باقاعدگی کی بنا پر تھی۔ عادات کے حوالے سے احسان دانش ایک اور جگہ پر یوں رقم طراز ہیں۔

> "پان تو میں اپنے استادِ اول قاضی محمد زکی صاحب کے گھر سے ہی کھانے لگا تھا مگر کبھی کبھی اس کے بعد شمعی کے یہاں کی آمد و رفت نے اضافہ ضرور کر دیا مگر پھر بھی دن میں ایک دو پان سے زیادہ نہ بڑھا مگر جب مشاعروں میں آمد و رفت کا سلسلہ شباب پر آیا تو شاعری کی مقبولیت کے ساتھ پان کھانے کی عادت بھی پختگی تک پہنچ گئی۔ لیکن جب سے ڈاکٹر حشمت آرا حجاب نے مجھ سے اصلاح کا سلسلہ شروع کیا اس وقت سے یہ عادت مرض کی صورت اختیار کر گئی۔ کیونکہ حشمت آرا حجاب پان کی اس قدر عادی ہیں کہ جب تک انہیں پان نہ ملے وہ اوٹ پٹانگ باتیں کرتی رہتی ہیں۔ جیسے وہ گھر سے لڑ کر آئی ہوں یا مجھ سے لڑنے کے منصوبے پر عمل کر رہی ہوں۔"(۲۶)

درج بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ احسان دانش کو پان کھانے کی عادت تھی اور اُن کو یہ عادت کیسے لگی کا ذِکر کیا گیا ہے۔ پھر مصنف ذِکر کرتے ہیں کہ یہ عادت پختہ اُس وقت ہوئی جب حشمت آرا نے احسان دانش سے شاعری میں اصلاح لینا شروع کی۔ کیونکہ حشمت آرا کو بھی پان کھانے کی عادت تھی اور یہ اس حد تک تھی کہ اِس کے بغیر وہ اوٹ پٹانگ باتیں کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اِس اقتباس کے مطالعے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اُن کی زبان کس طرح عام فہم اور رواں تھی۔ مصنف نے عاشق الرحمان کے بارے میں یوں بیان کیا ہے۔

> "عاشق الرحمان لکھنو کی قرب و جوار کا رہنے والا تھا اس میں شاعرانہ عادات وصفات بدرجہ اُتم موجود تھے، سلیس اور بے جھول اُردو بولتا تھا۔۔۔۔ چٹھی رساں تھا مگر اُس کی شرافت اور ہر دل عزیزی کے باعث گاؤں میں بڑی عزت تھی، پاس پڑوس کے لوگ اس کے مداح تھے اور وہ عزیزوں کی طرح ان کی خوشی اور غمی میں شریک رہتا اور مفید مشورے دیتا، ارد گرد کی عقیدت، خلوص اور محبت سے وہ اپنی غریب الوطنی کو بہلاتا رہتا جیسے بانجھ عورتیں پلاسٹک کے کھلونوں کو کپڑے پہنا کر خوش ہوتی ہیں۔۔۔۔"(۲۷)

احسان دانش نے عاشق الرحمان کہ اس تذکرے میں عاشق الرحمان کی عادات اور صفات کا تذکرہ کیا ہے۔ مذکورہ تذکرے میں مصنف بتاتے ہیں کہ عاشق الرحمان میں شاعرانہ عادات و صفات بدرجہ اُتم موجود تھی۔ اس کے علاوہ وہ بہت ہی سلیس اور بے جھول اُردو بھی بولتے تھے۔ مزید یہ کہ وہ چٹھی رساں تھے۔ اور اپنی شرافت اور

ہر دل عزیزی کے سبب لوگ اُن کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو اپنی فہم کے مطابق مفید مشوروں سے بھی نوازتا تھا۔ مذکورہ پیراگراف سے یہ معلومات بھی ملتی ہے کہ کس طرح مصنف شخصیت کے بطون میں اُتر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف نے عاشق الرحمان کی اخلاقیات اور سماجی و معاشی رویوں کے ذریعے صاحبِ تذکرہ شخصیت کی صحیح عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مذکورہ پیراگراف کو اگر دیکھا جائے تو اس میں تشبیہ کا استعمال کر کے احسان دانش نے عاشق الرحمان کی غریب الوطنی کا جو تذکرہ کیا ہے اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی نثر میں شاعر ہونے کی وجہ سے وہ پہلو بھی دَر آئے ہیں جو ایک شاعر کی نثر میں ہوتے ہیں۔

احسان دانش نے محمد اسحاق خان کا بھی تذکرہ کیا ہے جس میں اُن کی عادات و اطوار کے متعلق معلومات ملتی ہے۔ آپ ہاڑ گوڑ کے رہنے والے تھے۔ احسان دانش بیان کرتے ہیں کہ جب ان کی محمد اسحاق خان سے ملاقات ہوئی تو اس وقت وہ روزنامہ "سیاست" میں نائب مدیر کے عہدے پر فائض تھے - آپ کی عادات و اطوار کے متعلق مصنف لکھتے ہیں کہ:

> ”اسحاق خان صاحب پان اس قدر کھاتے تھے کہ ہر وقت ان کا منہ اُگال دان بنا رہتا تھا، مگر وہ بے سلیقہ انسان نہیں تھے میں نے کبھی اُن کے کپڑوں پر پان کی پیک کا دھبا نہیں دیکھا، تھوکتے تو بڑے احتیاط سے کہیں دور کونے کھدرے میں جا کر، مگر اس سلیقہ مندی کے ساتھ ساتھ ان کی نیفے میں آدھا لگا رہتا ایک دن میں نے اُن سے پوچھا کہ خان صاحب آپ ہر وقت یہ انٹی میں شراب کیوں لگائے پھرتے ہیں؟ اس پر خان صاحب فرماتے، میاں احسان یہ ام الخبائث میری داشتہ ہے اس سے دبی ہوئی پا کر دوسرے خبائث میرے قریب نہیں پھٹکتے! میں سُن کر خاموش ہو جاتا اور یقین کرنے کو جی نہ چاہتا کہ شراب کے بعد آدمی دوسرے گناہوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔“(۲۸)

احسان دانش نے جو تذکرہ اسحاق خان کا بیان کیا ہے اُس میں وہ ان کی عادات و اطوار کا تذکرہ بیان کر رہے ہیں۔ اسحاق خان پان کھانے کے اس قدر عادی تھے کہ ہر وقت اُن کا منہ اُگال دان بنا رہتا تھا۔ اُگال دان اُردو میں ایسے برتن کو کہتے ہیں جو عموماً تھوکنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اُگال دان ایسا برتن ہوتا ہے جو زیادہ تر صفائی یا تھوک کو مناسب جگہ پر رکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مُصنف یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ وہ پان کے زیادہ عادی تھے۔ لٰہذا اُن کے منہ میں موجود تھوک وہ تھوکنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ مگر اِس کے باوجود وہ سلیقے والے انسان تھے۔ کیونکہ مصنف یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ پان کے زیادہ استعمال کے باوجود کپڑے بچا کر رکھتے تھے۔ اگر اُنھوں نے تھوکنا ہوتا تو کسی کُونے کھدرے میں جا کر تھوکتے تھے۔ ہر جگہ کو وہ گندا نہیں کرتے تھے۔ اِس کے علاوہ شراب پینے

کے بھی عادی تھے مُصنف نے جب ان سے استفسار کیا تو انہوں نے بتایا کہ اُم الخبائث میری داشتہ ہے۔ داشتہ فارسی زبان کا لفظ ہے اور عموماً یہ ادبی جملوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ داشتہ سے مراد غیر ازواجی یا ناجائز تعلق والی عورت مراد لی جاتی ہے۔ اسحاق خان مُصنف کو بتاتے ہیں کہ اِس خبائث کے استعمال سے باقی خبائث اُن کے قریب نہیں پھٹکتے مگر مصنف خاموش ہو جاتے ہیں کہ جو شخص شراب پینے کا عادی ہو اُس پر یقین نہیں کیا جاسکتا کہ وہ باقی گناہوں سے محفوظ رہ گیا ہو۔ مصنف نے بڑی مہارت کے ساتھ اسحاق خان کے پان کھانے اور شراب پینے کی عادت کو قاری کے سامنے بیان کر دیا ہے جس سے با آسانی خاکے کے عناصر عادات واطوار پر معلومات مل جاتی ہے۔ اس کے لیے اُنہوں نے اُردو فارسی کے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ جس سے اسحاق خان کی شخصیت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

مذکورہ اقتباس میں اقبال ساجد کی عادت سگریٹ نوشی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مُصنف بتاتے ہیں کہ وہ سگریٹ نوشی کا اس قدر عادی ہے کہ خدا کی پناہ، کیسی ہی محفل یا سوسائٹی میں ہو اُس کا جب سگریٹ پینے کا جی چاہا اُس نے دوسروں کے سگریٹ اُٹھا کر پینا شروع کر دیے۔ وہاں پر موجود لوگ شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ شاعرانہ برادری کا فرد ہوتا ہے۔ اور اُسے چند لمحوں کے لیے رکھ رکھاؤ کا سہارا لینا چاہیے۔ اِسے کئی بار سمجھایا گیا ہے غصہ کیا گیا ہے مگر وہ عادت سے مجبور ہے کھسیانی ہنسی ہنس کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اور بات کو کسی دوسری طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ یہی حال اُس کی چائے کا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ شاعر یا ادیب ہیں بلکہ کوئی بھی تھوڑی بہت واقفیت والا شخص نظر آیا چائے مانگ لیتا ہے۔ اِس کے لیے یہ بات بڑی معمولی سی ہے۔ اِس اقتباس میں عادات و اطوار کے ذریعے اقبال ساجد کی شخصیت مکمل طور پر قاری کے سامنے آجاتی ہے کہ وہ کس قدر عادات سے مجبور ہے۔ مصنف نے بڑے ہی عام فہم الفاظ میں اقبال ساجد کی عادات و اطوار قاری کے سامنے بیان کر دی ہیں جس سے قاری کسی تکلیف کا شکار نہیں ہوتا۔

احسان دانش کے اِن تذکروں میں ایک تذکرہ حشمت آرا حجاب کا بھی ہے۔ مصنف نے اِن کو شاعرات کا جو کتاب میں عُنوان دیا ہے اس زمرے میں رکھا ہے۔ حشمت آرا حجاب ہومیو پیتھی کی ڈاکٹر ہیں۔ اِس کے علاوہ وہ بڑی زود گو شاعرہ بھی ہیں۔ حشمت آرا حجاب کے اِس تذکرے میں مصنف ان کی عادات کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

"تمبا کو کی اس قدر عادی ہو چکی ہیں کہ جب تک تمبا کو منہ میں نہ ہو وہ صحیح بات نہیں کر سکتیں، اوٹ پٹانگ باتیں کرتی رہتی ہیں، بعض وقت تو اِن پر آسیب زدگی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ نہایت شریف اور پاکباز خاتون ہیں۔"(۲۹)

درج بالا اقتباس میں حشمت آرا حجاب کا تذکرہ بیان کیا گیا ہے۔اِسی تذکرے میں خاکے کے اہم عُنصر عادات و اطوار پر مواد میسر آ جاتا ہے۔ حشمت آرا حجاب شاعرہ ہیں۔ وہ تمبا کو کی عادی ہیں اور یہ عادت اِس قدر پختہ ہو چکی ہے کہ اِس کے بغیر اُن کا گزارہ ممکن نہیں۔ جب تک وہ تمبا کو استعمال نہ کر لیں یا منہ میں رکھ نہ لیں وہ صحیح انداز میں بات نہیں کر سکتی اوٹ پٹانگ یعنی بے تکی باتیں کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ بعض اوقات تو آسیب زدگی کا گمان گزرتا ہے ایسا لگتا ہے جیسے اُن پر کسی چیز کا اثر ہو گیا ہو۔اِس کے علاوہ وہ شریف اور پاکباز خاتون ہیں۔ اِس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ احسان دانش کی حشمت آرا حجاب سے واقفیت دیرینہ تھی اور دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ چونکہ حشمت آرا حجاب اور احسان دانش دونوں شاعر ہیں لہٰذا نشست و برخاست میں اکثر ایک ساتھ ہوتے ہیں جس سے وہ ایک دوسرے کی عادات سے بھی آگاہی رکھتے ہیں۔ مذکورہ اقتباس بہت مختصر ہے اور زبان کا استعمال بھی عام فہم ہے مگر احسان دانش نے بڑی چابک دستی کے ساتھ حشمت آرا حجاب کا تذکرہ بیان کر دیا ہے۔ گویا معلوم ہوتا ہے اُنہوں نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہو۔ احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں اختر شیرانی کا بھی تذکرہ بیان کیا ہے۔ اختر شیرانی حافظ محمود خان شیرانی کے بیٹے تھے۔ اختر شیرانی پر بیان کیے گئے اِس تذکرے اُن کی عادات کے بارے میں معلومات ملتی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

"اختر شیرانی کے ناؤنوش کا حلقہ انہیں ابھار ابھار کر وہاں لے آیا تھا کہ وہ ترکِ بادہ پر حاوی نہیں آسکتے تھے سینکڑوں بار توبہ کی مگر۔

توبہ تو میں نے کی تھی ساقی کو کیا ہوا تھا۔

مے خانے میں جا کر توبہ کو صحیح سالم لانا وہ رندی کی توہین خیال کرتے تھے چنانچہ ان کی توبہ کے کئی عرس اس طرح ہوئے۔"(۳۰)

احسان دانش کہ اِس اقتباس میں جو اُنھوں نے اختر شیرانی کے حوالے سے بیان کیا ہے اِس میں بھی اختر شیرانی کی عادات و اطوار و پر معلومات ملتی ہے۔ احسان دانش نے اِس تذکرے میں فارسی کی ایک ترکیب ناؤنوش استعمال کی ہے جس سے مراد عیش و طرب یعنی نغمے سننے اور شراب پینے کے ہیں۔ اختر شیرانی کا حلقہ بھی عیش و طرب میں ڈوبا تھا۔ لہٰذا اختر شیرانی بھی شراب نوشی کرتے تھے۔ اُنھوں نے کئی دفعہ اس سے توبہ کی مگر ترکِ شراب نوشی پر حاوی نہیں آسکے۔ کیونکہ یہ عادت پختہ ہو چکی تھی لہٰذا اِس کو چھوڑنا مشکل ہو چکا تھا۔ شراب نوشی کے حوالے سے اسی تذکرے میں احسان دانش نے غالب کا مصرعہ بھی بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

توبہ تو میں نے کی تھی ساقی کو کیا ہوا تھا[۳۱]

ساقی سے مراد یہاں پر شراب پلانے والے کے ہیں۔ ساقی کے لفظ کا اُردو میں بہت دخل رہا ہے۔ مصنف یہ بیان کرنا چاہا رہے ہیں کہ وہ توبہ تو کر لیتے تھے مگر شراب خانے دوستوں کی محفل میں چلے جاتے تھے۔ جس سے ساقی شراب کے پیالے کو لے کر گھوم رہا ہوتا تھا اِسی سبب وہ اپنی توبہ کو سالم نہیں رکھ سکتے تھے اور پھر شراب پینا شروع کر دیتے۔ لہذا اُنھوں نے بہت دفعہ توبہ کی مگر اُس پر عمل نہ کر سکے۔ اِس اقتباس میں احسان دانش نے فارسی اور اُردو کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اور اِن الفاظ کے استعمال سے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اختر شیرانی کی شخصیت کِس طرح کی تھی۔ وہ توبہ کر کے بھی اِس پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ اور عادت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ اِس کے علاوہ غالب کا مصرع استعمال کر کے اس تذکرے میں روح ڈال دی ہے۔ جس سے احسان دانش کے صاحبِ مطالعہ ہونے کا بھی علم ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔www.rekhtadictionary.com Date 8 April 2024– Time – 3:04 pm

۲۔www.rekhtadictionary.com Date 8 April 2024– Time – 3:11 pm

۳۔احسان دانش، جہانِ دِگر، خزینہ علم و ادب، الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۲

۴۔ایضاً، ص۱۲۹

۵۔ایضاً، ص ۱۳۵

۶۔ایضاً، ص ۲۹۳

۷۔ایضاً، ص ۳۰۲

۸۔ایضاً، ص۳۱۱- ۳۱۲

۹۔ایضاً، ص۳۳۱

۱۰۔ایضاً، ص۳۴۱

۱۱۔ایضاً، ص۴۰۱

۱۲۔شاہد حنائی، اردو خاکہ نگاری، فن۔ تاریخ۔ تجزیہ، اکادمی بازیافت، اردو بازار کراچی، پہلی اشاعت فروری ۲۰۱۵ء، ص۶۱

۱۳۔احسان دانش، جہانِ دِگر، ص۳۷۷

۱۴۔ایضاً، ص۳۷۷

۱۵۔ایضاً، ص۳۸۱

۱۶۔ایضاً، ۳۸۲

۱۷۔ایضاً، ۳۸۵- ۳۸۶

۱۸۔ایضاً، ص۳۸۷

۱۹۔ایضاً، ص ۵۲۳

۲۰۔ایضاً، ص ۵۴۳

۲۱۔ایضاً، ص۵۶۹

۲۲۔ایضاً، ص ۶۰۵

۲۳۔حسن وقار گل، ڈاکٹر، اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد، شعبہ اردو جامعہ کراچی، کراچی، ۱۹۹۷ء ص ۶۵۳

۲۴۔صابرہ سعید، ڈاکٹر، اردو ادب میں خاکہ نگاری، زبیر بکس، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۸

۲۵۔ احسان دانش، جہانِ دِگر، ص ۳۷

۲۶۔ ایضاً، ص ۸۱

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۲۸۔ ایضاً، ص ۳۴۵

۲۹۔ ایضاً، ۳۸۸

۳۰۔ ایضاً، ۴۰۶

۳۱۔ ایضاً، ص ۴۲۶

باب چہارم:

"جہانِ دِگر" میں احوال و آثار کا تجزیاتی مطالعہ

الف۔ شخصیت کی متوازن عکاسی:

خاکہ نگاری کا ایک اہم عُنصر شخصیت کی متوازن عکاسی ہے۔ کسی بھی شخصیت کو سمجھنے کے لیے خاکہ نگاری میں اِس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ خاکہ یا تبصرہ لکھنے والا کتنا قابل اور ذہین ہے وہ شخصیت کے ہر ایک پہلو پر اگر نظر رکھتا ہے اور اُس کو اُسے بیان کرنے کا ہنر آتا ہے تو وہ خاکہ نگار کامیاب خاکہ نگار تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ شخصیت کی متوازن عکاسی میں شخصیت کے معیوب و محاسن برابر بیان کرنے ہوتے ہیں اِس کے لیے خاکہ نگار کو غیر جانبداری کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ عُنصر مشکل ضرور ہے مگر خاکہ نگاری میں اِس کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اِس کے ذریعے شخصیت مکمل طور پر واضح ہو کر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ متوازن کے معنی برابری کے لیے جاتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں چیز یا فُلاں شخصیت متوازن ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ پرکھنے والے نے ہر حوالے سے اُسے مدِ نظر رکھا ہے اور کسی بھی پہلو کو بیان کرنے سے نہیں چونکا۔ اِس حوالے سے شاہد حنائی اپنی کتاب "اردو خاکہ نگاری، فن تاریخ تجزیہ" میں بیان کرتے ہیں۔

> "اعتدال و توازن تو ہر صنفِ ادب کے لیے ضروری ہے لیکن خاکے کو خاکہ بنانے میں اِس کا بنیادی عمل ہے۔ اعتدال و توازن اگر نہ ہو تو خاکہ اپنی حدود سے نکل کر سوانح عمری بن جائے۔ خاکے میں تمام لوازمات کو نبھانے کے لیے خواہ صاحبِ خاکہ کی شخصیت کے مُثبت پہلو ہوں یا منفی، زبان و بیان ہو یا واقعات کا انتخاب ہر جُز کو توازن و اعتدال سے برتنا خاکے کے حُسن و رعنائی کا سبب بنتا ہے۔"(۱)

مذکورہ اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ خاکہ لکھنے والا جس شخصیت پر خاکہ لکھ رہا ہے اُس کی مُثبت و منفی پہلو، زبان و بیان اور واقعات کے انتخاب میں توازن سے کام لے گا تو خاکے میں حُسن پیدا ہو جائے گا۔ خاکے میں شخصیت کی متوازن عکاسی بہت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اِسی کے ذریعے قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے شاہد حنائی اِس بارے میں لکھتے ہیں:

"خاکے کا مختصر یا طویل ہونا اس کی خصوصیت نہیں بلکہ اس کا جامع، متوازن اور دلچسپ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ دلچسپی کا تعلق طرزِ تحریرُ نگارش ہی سے نہیں، واقعات کے انتخاب، اجزائے مطالب کی ترتیب و تالیف اور پیشکش کے حسن سے بھی ہوتا ہے۔"(۲)

دربالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خاکے کا مختصر یا طویل ہونا اس کی خوبی نہیں ہے بلکہ اس کی خوبی یہ ہے کہ جس شخصیت پر خاکہ لکھا جارہا ہے وہ جامع اور متوازن حالت میں بیان کیا جائے تاکہ قاری کی دلچسپی ٹوٹنے نہ پائے۔ احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں جو تذکرے قلمبند کیے ہیں اُن میں شخصیت کی متوازن عکاسی کی پیشکش بھی ملتی ہے۔ احسان دانش نے ڈاکٹر عبادت بریلوی کے حوالے سے جو تذکرہ بیان کیا ہے اُس میں شخصیت کی متوازن عکاسی پر بھی مواد ملتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی مصنف ہیں اور متعدد کتابیں آپ نے تصنیف کی ہیں۔ ابتدا سے آپ کا رجحان تنقید و تبصرے کی طرف رہا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے متعلق احسان دانش لکھتے ہیں:

"وہ شاگردوں سے بھی دوستوں کی طرح پیش آتے ہیں، اور اسٹاف سے برابر کا برتاؤ رکھتے ہیں میں ان کے اخلاق اور ذوقِ ادب دونوں کا مداح ہوں وہ ایک شریف انسان ہیں اور اپنے فرائض کی ادائی میں ہوشیار۔"(۳)

عبادت بریلوی پر مبنی اِس تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ کیسے اُن کی شخصیت تھی۔ عبادت بریلوی توازن کے ساتھ اپنی زندگی بَسر کر رہے تھے۔ اُن کا رکھ رکھاؤ اور برتاؤ شاگردوں کے ساتھ بھی دوستوں والا تھا۔ اِس کے علاوہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں سے بھی برابری کا سلوک روا رکھتے تھے۔ احسان دانش عبادت بریلوی پر لکھے ہوئے اس تذکرے میں عبادت بریلوی کی تعریف و توصیف بیان کر رہے ہیں۔ لہٰذا اس تذکرے کو مدحیہ اور توصیفی خاکہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کس طرح احسان دانش عبادت بریلوی کے اخلاق اور ذوقِ ادب کے مداح تھے۔ مصنف عبادت بریلوی کے بارے میں مزید بتاتے ہیں کہ وہ اپنے فرائض کے ساتھ کس طرح مخلص تھے۔ اِس تذکرے میں عقیدت اور خلوص کا رنگ نظر آتا ہے اور مصنف نے اپنے ممدوح کی زندگی کے کچھ حوالے قاری کے سامنے رکھ دیے ہیں جس سے شخصیت واضح ہوتی ہے۔

احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں فرخ امر تسری کا بھی تذکرہ بیان کیا ہے۔ احسان دانش نے "اساتذہ پنجاب یونیورسٹی اور دیگر معلمین" کے حوالے سے کتاب میں جو عُنوان دیا فرخ امر تسری کو اُس فہرست میں شامل کیا ہے۔ آپ کی وجہ شہرت بزمِ سروش کے سرگرم سیکرٹری کی ہے۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف اُن کا مشغلہ ہے۔ اِس تذکرے میں احسان دانش فرخ امر تسری کے بارے میں لکھتے ہیں: "وہ پرانے قدیم دُھچر قسم کے انسان تھے لیکن

نہایت زندہ دل اور صاحبِ ذوق، تقسیم کے وقت لاہور آ گئے اور لاہور ہی میں انتقال ہوا۔ "(۴) مذکورہ اقتباس سے فرخ امر تسری کی متوازن شخصیت احسان دانش نے قاری کے سامنے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرخ امر تسری پر بیان کیے گئے اس تذکرے میں احسان دانش نے علامتی انداز اپناتے ہوئے " ڈ ھچر " لفظ استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخ امر تسری پرانے زمانے یا پرانی طرز کے مطابق زندگی بسر کرنے والے انسان تھے۔ اور اُن کے ہاں قدامت پسندی یا روایتی خیالات پائے جاتے تھے۔ مصنف نے اس تذکرے میں ایک طرف تو ان کے عیب پر روشنی ڈالی ہے تو دوسری طرف ان کے فنی محاسن کو بھی بیان کیا ہے کہ وہ زندہ دل اور صاحب ذوق انسان تھے تقسیم کے بعد لاہور آئے اور یہیں ان کا انتقال بھی ہو گیا احسان دانش کے اِس تذکرے سے فرخ اتسری کی متوازن شخصیت واضح ہو کر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔

احسان دانش نے " جہانِ دِگر " میں مولانا سہا مجد دی کا بھی تذکرہ بیان کیا ہے۔ مولانا سہا مجد دی بھوپال کے رہنے والے تھے۔ احسان دانش نے " جہانِ دِگر " میں " اساتذہ پنجاب یونیورسٹی اور دیگر معلمین " کے حوالے سے جو عُنوان بنایا ہے مولانا سہا مجد دی کو بھی اُس فہرست میں شامل کیا ہے۔ احسان دانش جب بھوپال جاتے ہیں وہاں پر ایک مشاعرے میں اُن کی ملاقات مولانا سہا مجد دی سے ہوتی ہے۔ اُس ملاقات کے حوالے سے جب احسان دانش تذکرہ بیان کرتے ہیں تو اس میں شخصیت کی متوازن عکاسی قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جو خاکے کا ایک اہم عُنصر ہے جس سے شخصیت کے معیوب و محاسن قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔ احسان دانش اِس بارے میں لکھتے ہیں: " وہ نہایت فاضل اور فن شناس لوگوں میں ایک تھے اگرچہ ان کا قد چھوٹا تھا لیکن وہ بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے۔ "(۵)

درج بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنے اُسلوب کے لحاظ سے کس طرح بڑی سے بڑی بات بھی اختصار کے ساتھ بیان کر جاتے تھے اور صاحبِ تذکرہ شخصیت کو یہ بات ناگوار بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جس طرح مصنف نے مولانا سہا مجد دی کا تذکرہ بیان کیا ہے سب سے پہلے اُنھوں نے صاحبِ تذکرہ شخصیت کی تعریف و توصیف کی ہے کہ وہ کس طرف فن شناس اور قابل انسان تھے ساتھ ہی اُن کے پست قد کا بھی تذکرہ کر دیا ہے کہ وہ قد و قامت میں کچھ بڑے نہیں تھے قد جو کہ انسانی شخصیت کو دلکش بناتا ہے اُس کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ چوکنے نہیں بلکہ شخصیت کی متوازن عکاسی قاری کے سامنے کھینچ کر رکھ دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی اپنی شخصیت میں کس قدر فن شناسی تھی۔ پست قد کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ وہ کتنے بڑے ادیب اور شاعر تھے جس سے شخصیت مزید واضح ہو جاتی ہے۔

"جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے عبد الستار کا بھی تذکرہ بیان کیا ہے عبد الستار جوتے مرمت کرنے کا کام کرتا ہے۔ اِن کے اس تذکرے میں مصنف نے اِن کی شخصیت کی متوازن عکاسی قاری کے سامنے بیان کر دی ہے۔ مصنف اِس بارے میں لکھتے ہیں: "گورا رنگ، چوڑی پیشانی، سنہری داڑھی، میانہ قد اور سادہ لباس۔۔۔"(۶)

احسان دانش کے اس تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام شخصیت پر بھی تذکرہ بیان کر رہے ہیں اور اُن کے حال احوال، حُلیہ نگاری ملبوس اور شخصیت کی متوازن عکاسی پر بھی معلومات کا اندراج کر رہے ہیں۔ جس طرح اُنھوں نے عبد الستار کا تذکرہ بیان کیا ہے اِس میں خاکے کے اہم عُنصر شخصیت کی متوازن عکاسی پر بھی رُوشنی ڈالی ہے۔ رنگت کے لحاظ سے گورے رنگ کے مالک، چوڑی پیشانی سنہری داڑھی مگر قد کے لحاظ سے کوئی بڑی قد آور شخصیت نہیں تھے اور لباس بھی سادہ پہنتے تھے۔ اس تذکرے سے صاحب تذکرہ شخصیت کا حُلیہ، ملبوس، وغیرہ پر سادہ الفاظ میں خاکے کے اہم عُنصر شخصیت کی متوازن عکاسی پر معلومات مل جاتی ہے اور عبد الستار کی شخصیت ایسے ہی محسوس ہوتی ہے جیسے قاری صاحبِ تذکرہ شخصیت کو دیکھ بھال رہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنے فن کے لحاظ سے کمال بُلندی پر ہیں۔

احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں واحد رشیدی کا بھی تذکرہ بیان کیا ہے۔ اور اس تذکرے کو "صحافت پر لمحہ فکر" کے حوالے سے دیے گئے عُنوان کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ واحد رشیدی پر بیان کیا گیا یہ تذکرہ خاکے کے اہم عناصر شخصیت کی متوازن عکاسی پر پورا اترتا ہے۔ مصنف واحد رشیدی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "میرا ایک دوست جسے گردشِ روزگار نے کراچی رہنے پر مجبور کر دیا ہے، نہایت سلجھا ہوا ادیب لیکن دوستی کے معاملے میں عذاب جان، خداداد کالونی کراچی میں محلے کے خوبصورت مکانوں اور قادری مسجد کے بالمقابل اس کا مکان ایسا لگتا ہے جیسے ایک خوبصورت سفید گھوڑی نے زرد رنگ کا بد نسلا بچہ دے دیا ہو، بولتے ہوئے اس کی لکنت اس کی بھوؤں کو رہ رہ کے کمانیں کرتی رہتی ہے مگر جب کوئی بات اس کی طبیعت کے خلاف ہو تو وہ فوراً ہتھے سے اکھڑ جاتا ہے اور اس کے خدوخال جلدی جلدی گردش کرنے لگتے ہیں وہ یار باش قسم کا انسان ہے محلے بھر کے شاعر ادیب صوفی اور نوجوان ہڑدنگے اور شہر خبرے اس کی یہاں جمع رہتے ہیں۔۔۔۔"(۷)

احسان دانش نے مذکورہ اقتباس میں واحد رشیدی کے معیوب و محاسن دونوں کو بیان کیا ہے۔ اور اِس کے لیے اُنھوں نے غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ مصنف ذکر کرتے ہیں کہ واحد رشیدی جو کہ مصنف کے دوستوں میں شامل ہیں گردشِ روزگار کی چکی میں پِس رہے ہیں۔ سُلجھے ہوئے ادیب ہیں، مگر دوستی کے معاملے میں اس کے

برعکس ہیں۔ حُلیہ بیان کرتے ہوئے مصنف نے تشبیہ کا استعمال کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے سفید گھوڑی نے بد نسلا قسم کا بچہ دیا ہوا ہے۔ بولنے میں اُن کی زبان میں لُکنت ہے۔ غُصے کے تیز ہیں۔ مگر یار بَاش آدمی ہیں۔ مصنف نے اِس تذکرے میں صاحبِ تذکرہ شخصیت کی معیوب و محاسن متوازن صورت میں قاری کے سامنے بیان کیے ہیں مگر اس تذکرے میں واحد رشیدی کی تذلیل بھی کی ہے کہ وہ معلوم ہوتے ہیں جیسے گھوڑی نے بد نسلا قسم کا بچہ دے دیا ہے یہ جملہ پڑھنے والے کی طبعیت پر گراں گزرتا ہے اور واحد رشیدی کے لیے قاری کے دل میں محبت کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

احسان دانش نے " جہانِ دِگر" میں اقبال ساجد کا بھی تذکرہ بیان کیا ہے۔ اور اُن کے اِس تذکرے کو شعراء کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ احسان دانش کے بیان کیے گئے اس تذکرے میں شخصیت کی متوازن عکاسی قاری کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ مصنف اس بارے میں لکھتے ہیں۔

> "اقبال ساجد یوں تو تقسیم کے جوار بھاٹا میں انسانی سمندر سے نکلا ہوا کالا جھینگا معلوم ہوتا ہے سر کے بال موٹے، گہرا سرمئی رنگ، بڑی بڑی چمکدار آسیب زدہ سی آنکھیں، چہرے پر مالیخولیا کے آثار جو عموماً اس احساس برتری سے اُبھرتا ہے جو احساس کمتری کو چھپانے کے لیے عمل میں آتا ہے۔۔۔ لیکن اِن تمام باتوں کے باوجود وہ شاعر ہے اور اپنی ڈگر کا تنہا آدمی۔ اِس کا ایک خاص رنگ ہے جو صرف اس کی ذات تک محدود ہے۔ اس وصف کی وجہ سے اس کو قابل سمجھا جاتا ہے۔۔۔۔"(۸)

اس تذکرے میں احسان دانش نے سب سے پہلے فسادات کا تذکرہ کیا ہے کہ اقبال ساجد کس طرح فسادات سے نکلا ہوا انسان ہے۔ پھر اُس کے حلیے پر قلم آزمائی کی ہے۔ کہ وہ کالے رنگ کا انسان تھا سر کے بال موٹے، آسیب زدہ انکھیں اور کسی حد تک اِن میں اِس وجہ سے احساس کمتری بھی آگئی تھی اور وہ اِن کو چھپانے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ ایک طرف تو مصنف نے اقبال ساجد کے عیبوں پر روشنی ڈالی ہے دوسری طرف اِن کے اوصاف بھی بیان کر رہے ہیں کہ وہ ایک اپنی ڈگر کے بلند پایہ شاعر بھی ہیں۔ اور ایک خاص رنگ میں لکھتے ہیں۔ جس وجہ سے ان کو قابل سمجھا جاتا ہے۔ اِس تذکرے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف نے عیبوں کے ساتھ اوصاف کو توازن کے ساتھ قاری کے سامنے بیان کر دیا ہے۔

ب۔ تہذیبی حقائق کی پیشکش:

تہذیبی حقائق کی پیشکش خاکہ نگاری کا ایک اہم عُنصر ہے۔ جس طرح خاکہ نگار کے ہاں خاکہ لکھنے کے دیگر مقاصد ہو سکتے ہیں وہاں پر تہذیبی حقائق کی پیشکش کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ اُردو کے جتنے بھی بڑے خاکہ نگار ہیں اُن

کے ہاں اس فَن کو دیکھا جا سکتا ہے۔ تہذیبی حقائق کی پیشکش سے مراد وہ عناصر ہیں جن میں رسم ورواج، روایات، اقدار، ادب، فنونِ لطیفہ، موسیقی اور رقص، دستاویزی فلمیں، تاریخی مقامات، عجائب گھر، ثقافتی مراکز، زبان اور طرز زندگی کو مختلف طریقوں سے پیش کیا جائے تاکہ قاری کو اِن کے بارے میں آگاہی حاصل ہو۔ اِن حقائق کے ذریعے کسی بھی قوم کی شناخت اور تاریخ کو ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ مختلف تہذیبوں کے درمیان فرق اور مشترکات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ تہذیبی حقائق کی پیشکش سنجیدہ فن ہونے کے ساتھ ساتھ مشکل بھی ہے۔ مگر اِسی عناصر کے ذریعے ہی قاری کے سامنے وہ معلومات آجاتی ہیں جو بڑی مفید اور قاری کو مطلوب ہوتی ہیں۔ احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں اِن حقائق کو پیش کیا ہے یہ حقائق کئی کم ہیں اور کہیں زیادہ۔ اِنہی حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تہذیبی حقائق کی پیشکش کا جائزہ لیتے ہیں۔

"جہانِ دِگر" میں احسان دانش کے تذکروں میں تہذیبی حقائق کی پیشکش ملتی ہے۔ جس کے ذریعے قاری اُس دور کے حالات وواقعات اور تہذیب سے آگاہ ہو سکتا ہے کہ اُس زمانے میں رسم ورواج، روایات کیا تھے؟ نیز اُس زمانے کی اقدار، ادب، فنونِ لطیفہ، موسیقی، رقص، دستاویزی فلمیں، تاریخی مقامات، عجائب گھر، ثقافتی مراکز، زبان اور طرزِ زندگی کیا تھی۔ مثلاً جواہر لال نہرو کے تذکرے میں احسان دانش لکھتے ہیں:

> ”وہ رسم ورواج کے قائل نہیں تھے بلکہ انسانیت کے پرستار تھے۔ یہی سب سے انہوں نے اپنی تجہیز و تکفین کو بھی رسم ورواج سے علیحدہ کرنے کی وصیت کر دی تھی۔ وہ اُردو زبان کے شیدائی تھے اور جانتے تھے کہ برج بھاشا اور کھڑی بولی کی ترقی یافتہ صورت اردو ہے۔ اور یہی ایک ایسی زبان ہے جو پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاسکتی ہے لیکن چونکہ اُن کے چاروں طرف کا ماحول اُن کے اس نظریے کا قائل نہیں تھا اس لیے ہندی زبان کو ترجیح دے دی گئی حالانکہ وہ دن رات اردو بولتے تھے اور خط وکتابت کے علاوہ ان کی تصانیف جو اردو میں منتقل ہوئی ہیں وہ اصل سے زیادہ دلکش ہیں۔“[۹]

احسان دانش جس طرح جواہر لال نہرو کا تذکرہ کرتے ہیں اُس سے اُس زمانے کے حالات کے بارے میں آگاہی ملتی ہے۔ وہ رسم ورواج کی بجائے انسانیت کے چاہنے والے تھے اسی وجہ سے انہوں نے اپنی تجہیز و تکفین کو بھی تمام رسومات اور رواجوں سے علیحدہ کرنے کی وصیت کی تھی۔ احسان دانش اُردو زبان کے دلدادہ تھے اور انہیں معلوم تھا کہ اُردو برج بھاشا اور کھڑی بولی ہی کی جدید شکل ہے۔ جس کو پورے ملک میں بولا اور سمجھا جاتا ہے مگر ان کے اِرد گرد کا ماحول ایسا تھا کہ اُن کے نظریے کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ جس وجہ سے ہندی زبان کو فوقیت اور ترجیح دے دی گئی۔ اس اقتباس سے ہمیں اُس زمانے کے لسانی حوالوں کا عِلم ہوتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے

باوجود وہ اپنی تصانیف میں پُر لُطف اُردو زبان استعمال کرتے تھے۔ جو کسی سرمائے سے کم نہیں۔ " جہانِ دِگر " میں احسان دانش نے " صداقت امر ہے " کا جو عُنوان اپنی کتاب میں شامل کیا ہے اُس میں احسان دانش کی طرزِ زندگی کے حوالے سے معلومات ملتی ہے۔ احسان دانش لکھتے ہیں:

> "جب میں بیکار ہوتا اور کہیں کام نہ لگتا تو غلیل مارے کوے کی طرح اِدھر اُدھر دھکے کھاتا پھرتا۔ اور مجھے یہ لگتا کہ بے کاری کا آرام سے زیادہ کرب ناک ہے جو نتیجے میں اطمینان اور عافیت نہیں رکھتا، جب میں اس ناکارگی سے تنگ آ جاتا تو کئی تنہائی میں بیٹھ جاتا اور اللہ کا ذکر کرنے لگتا۔ اِس وقت میرا خیال یقین کی حد تک ہوتا کہ خدا کی مزدوری کر رہا ہوں اور وہ مجھے کسی نہ کسی صورت سے اس کا معاوضہ ضرور دے گا۔ اور ایک بار نہیں کئی بار ایسا ہوا کہ گھر سے نکلا ہوں اور مجھے معقول معاوضے کی مزدوری مل گئی۔ اگر مزدوری نہیں ملی تو کسی نہ کسی ویران راستے سے بقدرِ ضرورت مصارف مل گئے اور میں خدا کا شکر ادا کر کے اپنے مصارف میں لے آیا۔"(۱۰)

احسان دانش بڑے آدمی تھے۔ اَدب کی دنیا میں اُن کا احترام تھا۔ جس طرح وہ اپنے بچپن کا احوال بیان کرتے ہیں اُس سے ان کی اقدار کا علم ہوتا ہے۔ جب وہ فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے تھے تو اپنے اپ کو بہلانے کے لیے مختلف اشغال کو اپنا لیتے کیونکہ ایسی زندگی میں عافیت نہیں ہوتی۔ جب احسان دانش تمام اشغال سے بھی تنگ آ جاتے تو تنہائی میں بیٹھ کر اللہ کا ذِکر کرنے لگ جاتے۔ اور وہ اِس اطمینان کی زندگی میں تھے کہ اللہ کی مزدوری کر رہے ہیں اور اللہ کی ذات کسی نہ کسی صورت میں معاوضہ ضرور دے گی۔ ایسا کئی بار ہوا بھی کہ جب وہ گھر سے نکلتے تو کوئی معقول مزدوری مل جاتی۔ یا پھر ایسے کوئی اسباب بن جاتے جس سے وہ اطمینان والا دِن بسر کر سکتے۔ اِس اقتباس سے احسان دانش کی طرزِ زندگی کا بھی علم ہوتا ہے کہ کس طرح وہ معاشی طور پر زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور اِن کی اِس حوالے سے قدریں کیا تھیں۔ احسان دانش نے " جہانِ دِگر " میں " گھریلو عذاب " کا جو عُنوان دیا ہے۔ اُس میں اُنھوں نے تہذیبی حقائق کی پیشکش کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ وہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

> "جہلم سے نکل کر میں نے کھڑکی کھولی تو سورج کی سنہری کرنیں چٹانوں پر نام کھودنے میں مصروف تھی اور غاروں کے نشیبوں میں روشنی کے زینے اُتر رہے تھے، سڑک کے دونوں طرف پانی کے ریلوں سے مسمار زمین پر شوالوں کی طرح میلوں کٹاؤ ہی کٹاؤ پھیلے ہوئے تھے، یہ مرحوم تہذیبوں اور مدفون واقعات کا قبرستان میرے لیے فکر انگیز تھا کیونکہ پتھروں کے پرت، زمین کے گاؤں کے گھاؤ، ساحلوں کے کٹاؤ اور درختوں کی کھالیں تو خاص طور پر تاریخ کی غمازی کرتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی گفتگو بھی کچھ کم خیال انگیز نہیں تھی۔"(۱۱)

مذکورہ اقتباس سے تہذیبی حقائق کی پیشکش کا علم ہوتا ہے۔ کہ وہ کِس طرح راولپنڈی مشاعرے کی غرض سے جارہے تھے تو راستے میں جہلم سے نکلتے ہوئے جب وہ کھڑکی کھولتے ہیں تو سورج کی کرنوں سے انہیں وہ غار نظر آتے ہیں۔ جو کافی طویل سے طویل ہوتے جارہے ہیں، اور اپنے عہدِ رفتہ کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ اور پانی کے ریلوں نے میلوں کٹاؤ کر دیا ہے اور اب یہ مرحوم تہذیب میں دفن ہوتے جارہے ہیں۔ یہاں پر سکندرِ اعظم جیسی شخصیت نے قیام کیا تھا اور یہ وہی علاقہ ہے جو تاریخی حوالے سے بڑا اہم ہے۔ یہ پیراگراف جہلم سے لے کر راولپنڈی تک کی تہذیب پر مبنی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ احسان دانش کے زمانے میں علاقہ مسمار ہوتا جارہا تھا جو جو اب دوبارہ کسی حد تک پھیلنے پھولنے لگا ہے۔ اس پیراگراف سے احسان دانش کے زمانے کی تہذیب کا حوالہ ملتا ہے۔

احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں "مطالعہ کے چند روز" کے حوالے سے جو عُنوان قائم کیا ہے۔ اُس میں آپ کے طرزِ زندگی کے حوالے سے معلومات مل جاتی ہے اور اِسی کے ساتھ اُس زمانے کی تہذیب کا بھی علم ہوتا ہے۔ احسان دانش لکھتے ہیں کہ:

> "جب مجھے ذرا ہوش آیا اور اعصابی تشنج سے نجات ملی تو میں نے چاروں طرف ایڑیاں اٹھا اٹھا کر نظر دوڑائی، بے فکری اور آسائش کی طرف تو مجھے زندگی پر دور دور تک سایہ نظر نہ آیا لیکن زندگی کے راستے میں پھیلا ہوا جھاڑ جھنکاڑ مجھے دل برداشتہ نہ کر سکا، کیونکہ میرا جسم مشقت کی بھٹیاں جھیل چکا تھا اور میں معمولی درجے کی زندگی سے گھبرانے کی بجائے دلچسپی لینے لگا تھا چنانچہ اس طرح اُجالے میں کفنائے ہوئے دن اور جُھلسی ہوئی دھوئیں میں رچی راتیں آتی جاتی رہیں۔"(۱۲)

درج بالا اقتباس بھی احسان دانش کی طرزِ زندگی اور اقدار پر مبنی ہے۔ احسان دانش کو جب اعصابی تشنج سے نجات ملتی ہے۔ تشنج جسے ٹرسمس بھی کہا جاتا ہے جو اعصابی نظام سے متعلق ایک سنگین انفیکشن ہے۔ تو وہ ہر طرف نگاہ دوڑاتے ہیں مگر بے فکری اور آسائش کئی دور دور تک نظر نہیں آتی۔ زندگی میں ہر طرف جھاڑ جھنکاڑ نظر آتا ہے اور جسم مشقت کی بھٹیاں جھیل چکے ہوتے ہیں تو وہ اس طرح کی زندگی سے بددل ہونے کی بجائے اِس میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ جس سے اچھے بُرے دِن اُن کی زندگی میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ "جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کا جو تذکرہ بیان کیا ہے اُس میں مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کی ادب کے حوالے سے خدمات کا علم ہوتا ہے۔ اور اُسی تذکرے سے اُس زمانے کی تہذیب بھی پتا چلتی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ: "مولانا صلاح الدین نے ادب ہی پیدا نہیں کیا بلکہ اُس نے بہت سے ادیبوں کو عالم آشنا کیا ہے۔ اُن کے رسالے "ادبی دنیا" میں جو ادیب چھپتے تھے وہ قریب قریب مولانا موصوف ہی کی دریافت تھی۔ چنانچہ پنجاب کے مشہور

اور آزاد خیال ادیب میرا جی اور چودھری ابو الفضل صدیقی جیسا ادیب بے بدل بھی ادب کو مولانا موصوف ہی کی دین ہے۔"(۱۳)

احسان دانش نے مولانا صلاح الدین احمد مرحوم پر جو تبصرہ بیان کیا ہے اِس کی معلومات سے یہ عِلم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ادب ہی پیدا نہیں کیا بلکہ بہت سے ادیبوں کو بھی اُنھوں نے علماء سے روشناس کرایا۔ اور وہ جو رسالہ "ادبی دنیا" کے عُنوان سے لکھتے تھے اِس میں تقریباً تقریباً جو ادیب لکھتے تھے وہ بھی مولانا صلاح الدین ہی کی دریافت ہیں۔ اِس کے علاوہ احسان دانش کے اِس تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرا جی اور چودھری ابو الفضل صدیقی جیسے بڑے ادیب جن کا کوئی بدل نہیں وہ بھی مولانا صلاح الدین احمد ہی کی دین ہیں۔ اُنھوں نے خود صرف ادب تخلیق نہیں کیا بلکہ ادیب بھی دریافت کیے ہیں۔

احسان دانش نے حبیب جالب پر جو تذکرہ قلمبند کیا ہے اُس تذکرے میں بھی تہذیبی حقائق کی پیشکش کا تذکرہ ملتا ہے۔ اِس تذکرے کے ذریعے اُس زمانے کے سماجی تہذیبی حوالوں کا علم ہوتا ہے۔ احسان دانش لکھتے ہیں کہ: "سماج کی بے راہ روی ہو یا حکومت کی لغزش یہ اپنے گیتوں اور نظموں میں بڑی دیدی دلیری سے رگیدتا اور صاف گوئی سے طنز و طعن کے علاوہ دل خراش تنقیض کرتا ہے۔"(۱۴)

مذکورہ اقتباس حبیب جالب پر لکھا گیا ہے جس میں سماج کی بے راہ روی یا حکومت کی لغزشوں کا علم ہوتا ہے کہ اُن کے زمانے میں ایسے حالات وقوع پذیر ہوتے رہے ہیں جن میں حکومت کبھی گرتی کبھی سنبھل رہی تھی۔ حبیب جالب کا زمانہ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۹۳ء بنتا ہے۔ اِس زمانے میں حبیب جالب اپنے گیتوں کے ذریعے نڈر اور بے خوف ہو کر سماج اور حکومت کے پیچھے پڑ جاتے اور بڑی ہی دیدہ دلیری سے طنز و طعن کے علاوہ بھی اُن واقعات کی مذمت کرتے جو سماجی حوالے سے بہتر نہیں تھی۔ "جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے "اساتذہ پنجاب یونیورسٹی اور دیگر معلمین" کے حوالے سے جو عُنوان قائم کیا ہے اُس میں تہذیبی حقائق کی پیشکش، کے حوالے سے مواد ملتا ہے۔ اِس بارے میں احسان دانش لکھتے ہیں کہ:

> "پنجاب کے اہلِ فکر نے اپنے علمی ادبی اور ثقافتی کے علاوہ معاشی اور معاشرتی مسائل کے جائزے اور تبصرے کے لیے ۱۸۶۵ء میں ڈاکٹر لیٹنر کی سربراہی میں انجمنِ پنجاب کی بنیاد رکھی تھی، چونکہ اِس میں پر خلوص لوگ شامل تھے اس لیے انجمنِ پنجاب میں وہ کتابیں چھپیں جو معاشرے کے بنیادی مسائل کو حل کرنے میں مدد و معاون نظر آئیں۔"(۱۵)

درج بالا اقتباس "پنجاب یونیورسٹی اور دیگر معلمین "کا تذکرہ کرنے سے قبل تمہید میں احسان دانش نے قلمبند کیاہے۔ اور اِس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیراگراف ۱۸۶۵ء کی معلومات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اِس پیراگراف میں احسان دانش نے بتایا ہے کہ اس انجمن کو کیسے بنایا گیا تھا۔ پنجاب کے اہلِ فکر لوگوں نے اپنی علمی، ادبی، ثقافتی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے تبصرے کے لیے ۱۸۶۵ء میں جو انجمن بنائی تھی اِس میں پُر خلوص لوگ شامل تھے۔ اور اِسی انجمن کے ذریعے ایسی کتابیں شائع ہوئیں جو معاشرے کے بنیادی مسائل کو حل کرنے میں معاون نظر آئیں۔ البتہ احسان دانش نے اُن کتب کا ذِکر نہیں کیا مگر اِس سے تہذیبی حقائق پر معلومات مل جاتی ہے۔

ج۔ شخصی تاثر کی پیشکش:

خاکہ نگاری میں شخصی تاثر کی پیشکش کافی اہم عُنصر ہے۔ اِس کے ذریعے شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ شخصی تاثر کی پیشکش سے یہ مراد لیا جاتا ہے کہ خاکہ نگار صاحبِ خاکہ شخصیت کا تاثر اُس کے رویے، بول چال، لباس، ظاہری شکل، تعلقات، قابلیت اور اخلاقیات سے قاری پر صاحبِ خاکہ شخصیت کا اَثر ڈالتا ہے۔ خاکہ نگار نے جو تاثر صاحبِ خاکہ کی شخصیت سے خود لیا ہوتا ہے وہی تاثر قاری کے دل و دماغ میں پیدا کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ خاکے کا مقصد ہی کسی شخصیت کے متعلق تاثر کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ اِس کے لیے خاکہ نگار ایسے واقعات، انکشافات، اور بیانات کا انتخاب کرتا ہے جو خاکے میں ساعت بہ ساعت تاثر کو بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شمیم حنفی شخصی تاثر کی پیشکش کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں: "اچھے خاکے کی تعریف یہ ہے کہ کسی شخصیت کے کچھ اہم یا منفرد پہلو ایسی ماہرانہ نفاست کے ساتھ بیان کیے جائیں کہ قاری پر اس شخصیت کا مخصوص تاثر پیدا ہو جائے اور اس کے افکار و کردار کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو مل جائیں۔"(۱۶)

مذکورہ اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شخصیت کے کچھ پہلوؤں کو ماہرانہ انداز میں قاری کے سامنے پیش کرنا ہے جس سے قاری مخصوص تاثر لے اور اُس کی فکر و کردار کے ساتھ جھلکیاں دیکھنے کو ملیں۔ احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں حفیظ میرٹھی کا تذکرہ بیان کیا ہے۔ اور اِس تذکرے کو "اساتذہ پنجاب یونیورسٹی اور دیگر معلمین "کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ اس تذکرے میں شخصی تاثر کی پیشکش کی جھلک بھی ملتی ہے۔ احسان دانش، حفظ میرٹھی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "دہلی میں صرف ایک بار کی ملاقات ہے مگر مجھ پر انہوں نے ایسا تاثر چھوڑا کہ بہت کم لوگ اِس تاثر کے ہوں گے وہ اسلامی رجحانات کے آدمی ہیں۔ اور میں ان لوگوں میں نہیں جو اسلامی تہذیب و تمدن اور فکر و فلسفہ کو ایک معمولی اور محدود تصور خیال کرتے ہیں۔۔۔"(۱۷)

حفیظ میرٹھی پر بیان کیا گیا یہ تذکرہ مصنف کے ذاتی تاثرات واحساسات پر مبنی ہے۔ احسان دانش نے حفیظ میرٹھی کے حوالے سے بیان کیے گئے اِس تذکرے میں مثبت تاثر قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ مصنف حفیظ میرٹھی کے اس تذکرے میں اپنی عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار کر رہے ہیں۔ حفیظ میرٹھی نے اپنی پہلی ملاقات میں ہی مصنف پر ایسا تاثر چھوڑا ہے کہ وہ حفیظ میرٹھی کے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ حفیظ میرٹھی اسلامی تہذیب و تمدن کے آدمی ہیں اور مصنف بھی ان چیزوں کی قدر کرتے ہیں اور اِن اسلامی تصورات کو معمولی یا کم خیال نہیں کرتے۔ مصنف نے سادہ زبان کا استعمال کرتے ہوئے قاری کے سامنے شخصی تاثر کو پیش کر دیا ہے۔ اور یہ تاثر مصنف نے حفیظ میرٹھی سے خود لیا ہے اور یہی تاثر قاری کے دل و دماغ میں پیدا کر دیا ہے۔ احسان دانش نے "جہانِ دِگر" میں اقبال سہیل کا بھی تذکرہ بیان کیا ہے۔ اور انہیں بھی "اساتذہ پنجاب یونیورسٹی اور دیگر معلمین" کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ اقبال سہیل کی وجہ شہرت بطور شاعر بھی ہے۔ اقبال سہیل پر بیان کیے گئے اس تذکرے میں شخصی تاثر کی پیشکش بھی ملتی ہے۔ مصنف بیان کرتے ہیں کہ:

> "جب میں اعظم گڑھ گیا تو جہاں دارالمصنفین کے اراکین سے مل کر یک گونہ مسرت ہوئی۔ وہیں اقبال سہیل صاحب کے رویے اور اخلاق سے بھی متاثر ہوا۔ مجھے ان کے کلام سے زیادہ ان کی شخصیت میں کشش معلوم ہوئی ہر چند کے ان کے کلام میں حکمت بھی ہے اور پاکیزگی بھی زبان پر قدرت بھی ہے اور الفاظ کی گھن گرج بھی اور یہی وہ چیزیں ہیں جو شاعر کے مرتبے اور مقام کی ضامن ہوتی ہیں۔۔۔۔"(۱۸)

احسان دانش کے تذکرے پڑھتے ہوئے شخصی تاثر کی پیشکش دیکھ کر قاری حیران رہ جاتا ہے کہ کس طرح شخصی تاثر سے شخصیت مکمل طور پر واضح ہو کر قاری کے سامنے آ رہی ہے۔ مصنف جب اعظم گڑھ جاتے ہیں تو وہاں پر دارالمصنفین کے ارکان سے مل کر ایک طرف تو انہیں خوشی ہوتی ہے وہیں پر اقبال سہیل کے اخلاق سے بھی متاثر ہوتے ہیں اور وہ کلام سے زیادہ اقبال سہیل کی شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ مصنف کا ماننا ہے کہ اقبال سہیل کے کلام میں حکمت، پاکیزگی اور الفاظ کی گھن گرج بھی موجود ہے مگر زیادہ تر مصنف اقبال سہیل کی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے اور اقبال سہیل کی شخصیت سے متاثر ہونے کی وجہ سے قاری کی دل و دماغ میں اِن کی شخصیت کی تصویری جھلک دکھانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ جو ایک اچھے خاکہ نگار کی خوبی ہوتی ہے۔

"جہانِ دِگر" میں شاہ ابو القاسم پر بھی تذکرہ ملتا ہے۔ شاہ ابو القاسم شاعر تھے اور ادب سے گہر الگاؤ رکھتے تھے۔ آپ کا نام علمی حوالے سے بڑا معتبر سمجھا جاتا تھا۔ اِن پر بیان کیے گئے تذکرے میں خاکے کے اہم عُنصر شخصی تاثر کی پیشکش پر بھی مواد ملتا ہے۔ مصنف شاہ ابو القاسم کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"جوانی میں بڑے حسین و جمیل آدمی ہوں گے۔ بڑھاپے میں بھی اِن کا میدہ شہاب رنگ، سُرخ باریک ہونٹ، آنکھوں میں جگار کے سرخ ڈورے اور سنہری داڑھی ان کی تبلیغی گفتگو سے انہیں ہر آدمی ولی سمجھنے پر مجبور تھا۔ جب وہ تصوف کے مسائل پر گفتگو کرتے اور اخلاقی بلندیوں سے بولتے تو ٹیڑھے سے ٹیڑھا آدمی احترام پر مجبور ہو جاتا۔"(۱۹)

درج بالا اقتباس میں شاہ ابو القاسم کے شخصی تاثر کی پیشکش ملتی ہے۔ بڑھاپے میں احسان دانش ان کا حُلیہ دیکھنے کے بعد یہ تاثر لیتے ہیں کہ وہ جوانی میں حسین و جمیل آدمی ہوں گے جس سے قاری کی ذہن میں بھی آپ کی تصویری جھلک ملتی ہے۔ اور اُن سے گفتگو کے بعد آدمی اُن کو ولی سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور تصوف پر گفتگو سننے کے بعد ٹیڑھا آدمی بھی عزت کرنے لگ جاتا ہے۔ اِس تذکرے میں مصنف مرعوب ہوتے ہوئے نہیں بلکہ متاثر ہو کر قاری کے سامنے معلومات کو بیان کرتا ہے جس سے قاری بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے مولانا عبد المالک آروی کا بھی تذکرہ بیان کیا ہے۔ اور اُنھیں "چاندنی کے سائے" کے حوالے سے جو عُنوان قائم کیا ہے اُس فہرست میں شامل کیاہے۔ مولانا عبد المالک آروی پر بیان کیے گئے اِس تذکرے میں شخصی تاثر کی پیشکش کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ مصنف اِس بارے میں بیان کرتے ہیں:

"مولانا عبد المالک آروی کی خشخشی داڑھی، غلافی آنکھیں اور پھر ان کا طرزِ گفتگو پہلی بار ملنے سے دل پر نقش ہو گیا تھا، ان کے لہجے میں لوچ، بات میں نرمی حافظے میں علمی ذخائر اور سینے میں تحقیق و تدقیق کا شعلہ تاثر دیے بغیر نہیں رہتا تھا۔۔۔"(۲۰)

احسان دانش کے اِس تذکرے سے جو اُنھوں نے مولانا عبد المالک آروی پر لکھا ہے۔ احسان دانش کے مردم شناس ہونے کا پتہ لگتا ہے۔ اُنھوں نے یہ تذکرہ اپنے تاثرات و جذبات اور عمیق شخصی مطالعے کے بعد قائم کیا ہے۔ مصنف جب پہلی بار مولانا عبد المالک آروی سے ملتے ہیں تو اُن کو اُن کی خشخشی داڑھی اور غلافی آنکھوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ پھر جب اُن سے گفتگو ہوتی ہے تو یہ گفتگو ان کے دل میں گھر کر لیتی ہے۔ مصنف مزید بیان کرتے ہیں کہ اُن کی باتوں میں نرمی تھی اور حافظے کے لحاظ سے علمی شخصیت تھے۔ اور اُن کے سینے میں تحقیق و تدقیق کا شعلہ اِس قدر تھا کہ مصنف اس سے متاثر ہو گئے۔ مصنف نے مولانا عبد المالک آروی کی شخصیت کے تمام گوشے قاری کے سامنے رکھ دیے ہیں یہ مصنف کی تحریر کا خاصہ ہے کہ جس طرح مصنف خود متاثر ہوتا ہے ویسے

قاری بھی متاثر ہو رہا ہے جو ایک کامیاب خاکہ نگار کی بھی خوبی ہے۔ شخصی تاثر کی پیشکش کے حوالے سے جاوید حیات کا تذکرہ بھی احسان دانش نے "جہانِ دِگر میں بیان کیا ہے اور اِن کو بھی "چاندنی کے سائے" کے حوالے سے جو فہرست بنائی ہے اس میں شامل کیا ہے۔ اِن پر بیان کیے گئے اس تذکرے میں خاکے کے اہم عناصر شخصی تاثر کی پیشکش پر مواد ملتا ہے۔ مصنف اس بارے میں لکھتے ہیں:

"کتابی چہرے پر میدہ شہاب اور شربتی غلافی آنکھیں، انہی سے ملتی جلتی سیاہی مائل زعفرانی خشخشی داڑھی اور بھرا بھرا جسم کوئی حق پسند نظر دیکھے تو درود سے فرصت نہ ملے اور شر کے دیدبان سے دیکھے تو کفِ افسوس ملنے کے سوا چارہ کار نہ ہو۔ وہ ہونٹوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے جب موقع بموقع آنکھوں سے مسکرا پڑتے تو صاحب احساس کی روح سجدے کے لیے نیت باندھ لیتی ہے۔"(۲۱)

مذکورہ پیراگراف میں مصنف نے حُلیہ نگاری کے حوالے سے مختلف الفاظ اور تراکیب استعمال کرکے جاوید حیات کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ کہ وہ کس طرح نظر آتے تھے۔ اُن کا چہرہ کتابی رنگ، شربتی غلافی آنکھیں سیاہی مائل زعفرانی خشخشی داڑھی اور جسم بھرا ہوا تھا۔ اگر اُن کو اچھی نیت والا آدمی دیکھے تو متاثر ہوئے بنا نہ رہے اور اگر بد نظر والا دیکھے تو افسوس کرنے لگے۔ اُن کی باتوں میں مٹھاس تھی اور وہ موقع بموقع مسکراتے رہتے تھے جس سے مصنف نہ صرف خود متاثر ہوئے بلکہ انہوں نے قاری کے سامنے شخصیت کا ایسا تاثر پیش کر دیا ہے جس سے قاری بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ احسان دانش نے ابراہیم جلیس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ "جہانِ دِگر" میں "صحافت پر لمحہ فکر" کے حوالے سے احسان دانش نے جو عُنوان دیا ہے ابراہیم جلیس کو اُس فہرست میں شامل کیا ہے۔ ابراہیم جلیس پر بیان کیے گئے اِس تذکرے میں شخصی تاثر کی پیشکش پر مواد ملتا ہے۔ احسان دانش اِس بارے میں لکھتے ہیں:

"یوں تو مجھے ہر ادیب اور شاعر کے علاوہ صحافی سے ایک دلی لگاؤ ہے لیکن بعض لوگ ایسے ہیں کہ میں ان کے طریق فکر اور اسلوبِ بیان کے علاوہ ان کے اُصولِ حیات سے بھی متاثر ہوں انھیں میں ایک ابراہیم جلیس بھی ہے، یہ وہ شخص ہے جو بھوک کی شدت اور حالات کے فشار میں بھی اپنے قلم کو کرائے پر نہیں چلاتا، حالانکہ اس کینڈے کا صاحب قلم اگر ذرا اپنے مقام سے ہٹ جائے تو زندگی اور حالات کی بہت سی گرفتوں کو نرم کر سکتا ہے، لیکن جلیس نے کبھی ایسا نہیں کیا، وہ غریبوں مفلسوں اور اچھے لوگوں کا ترجمان رہا ہے، وہ قلم کے معاملے میں لگی لپٹی کا قائل نہیں، وہ جس قدر مہذب ہے اُسی قدر تحریر میں بے باک ہو جاتا ہے۔۔۔"(۲۲)

"جہانِ دِگر" میں بیان کیا گیا یہ تذکرہ مشہور و معروف صحافی ابراہیم جلیس کا ہے۔ مصنف کا ماننا ہے کہ وہ ہر ادیب، شاعر اور صحافی سے دِلی لگاؤ رکھتے ہیں مگر جن کے اُسلوب سے مصنف متاثر ہیں وہ ابراہیم جلیس ہیں۔ کیونکہ یہ بکاؤ نہیں جیسے بھی حالات ہوں وہ لگی لپٹی نہیں رکھتا اور بے باک ہو کر تحریریں قاری کے سامنے بیان کرتے ہیں جس سے مصنف متاثر ہیں اور ابراہیم جلیس کی ایسی تصویر قاری کے سامنے بیان کر دی ہے جس سے قاری بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔اِس تذکرے میں مصنف کا اُسلوب سادہ اور رواں ہے جس سے قاری با آسانی تمام مفاہیم سمجھ لیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔شاہد حنائی، اردو خاکہ نگار، فن۔ تاریخ۔ تجزیہ، اکادمی بازیافت، اردو بازار کراچی، پہلی اشاعت فروری، ۲۰۱۵ء، ص ۴۱

۲۔ایضاً، ص ۳۰

۳۔احسان دانش، جہانِ دِگر، خزینہ علم و ادب، الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۰۶

۴۔ایضاً، ص ۳۳۷

۵۔ایضاً، ص ۶۱۵

۶۔ایضاً، ص ۱۷۸

۷۔ایضاً، ص ۳۵۴

۸۔ایضاً، ص ۳۶۷

۹۔ایضاً، ص ۶۹

۱۰۔ایضاً، ص ۳۴

۱۱۔ایضاً، ص ۱۱۰

۱۲۔ایضاً، ص ۳۵

۱۳۔ایضاً، ص ۱۳

۱۴۔ایضاً، ص ۳۶۴

۱۵۔ایضاً، ص ۴۰۲

۱۶۔ شمیم حنفی، ڈاکٹر، مرتب آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، اردو اکادمی، دہلی، طبع چہارم، ۲۰۰۴ء ص ۱۱

۱۷۔احسان دانش، جہانِ دگر، ص ۵۵۴

۱۸۔ ایضاً، ص ۶۱۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۰۳

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۳۰

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۳۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۵۶

باب پنجم:

ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ

مذکورہ تحقیق خاکہ نگاری کے عناصر: "جہانِ دِگر" از احسان دانش کا تجزیاتی مطالعہ پر مبنی ہے۔ اِس تحقیق میں خاکہ نگاری کا معنی و مفہوم، عناصر اور روایت کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ اُردو خاکہ نگاری کے آغاز کے بارے میں مختلف آراء ہیں کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی کتاب "مولوی نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری کچھ اُن کی زبانی" کو پہلا خاکہ تسلیم کرنا چاہیے یا پھر مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب "آبِ حیات" کو آغاز قرار دینا چاہیے۔ اِس حوالے سے دونوں طرف دلائل موجود ہیں اگر دیانتدارانہ رائے دی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس ضمن میں یہ دونوں کتابیں ابتدائی کاوشیں تھیں۔ تب تک خاکے کے حوالے سے کوئی واضح تصور یالوازمات طے نہیں ہوئے تھے، اِس دور میں ایسی صنف میں طبع آزمائی قابلِ داد ہے۔ اِن دونوں کتابوں کو مکمل خاکوں کے طور پر نہ بھی مانا جائے تو نصف خاکے ضرور تسلیم کرنے چاہیے کیونکہ بعد میں آنے والوں نے اِن سے ہی رہنمائی حاصل کی۔ اور یوں خاکہ نگاری کے اس سفر میں فنی خصائص سمیت بطورِ صنف اِس کو متعارف کروایا گیا۔

تقسیم کے بعد خاکہ نگاری کی طرف مزید رحجان ہوا۔ اور مصروفیات کی وجہ سے باقی غیر افسانوی نثر کی بجائے خاکہ نگاری نے زور پکڑنا شروع کر دیا۔ اور بے شمار خاکہ نگار سامنے آنے لگے جن میں مولوی عبدالحق، شاہد احمد دہلوی، چراغ حسن حسرت، شوکت تھانوی، عطاالحق قاسمی، سعادت حسن منٹو، مشتاق احمد یوسفی ، ضمیر جعفری، عصمت چغتائی، محمد طفیل، گُل نوخیز اختر، اشفاق احمد ورک جیسے بڑے نام خاکہ نگاری کے ساتھ جڑے اور ادب میں خاکہ نگاری کی ترقی میں اپنا کردار ادا کیا۔ چونکہ خاکہ نگاری ایک وسیع موضوع ہے اور خاکہ نگار بھی بہت زیادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "جہانِ دِگر" میں خاکہ نگاری کے عناصر کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ "جہانِ دِگر" احسان دانش کے تذکروں کی کتاب ہے جس میں احسان دانش نے مختلف عُنوانات قائم کیے ہیں اور عزیز و اقارب، دوست احباب، اساتذہ کرام کے ساتھ تعلقات کا اظہار کیا ہے۔ اِسی اظہار میں شخصیت کے ایسے دلچسپ عناصر لکھ دیے ہیں جن کو خاکہ نگاری کے عناصر تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ مکمل خاکے تو نہیں مگر خاکہ نگاری کی روایت میں اس کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ کسی بھی صنف کے ارتقاء میں ایسے تمام نمونوں کو اہمیت دی جاتی ہے جس سے گزر کر وہ صنف دورِ جدید تک پہنچتی ہے۔

زیرِ بحث تحقیق میں حُلیہ نگاری، شخصی عادات و خصائل، احوال و آثار جو کہ خاکے کے اہم عناصر ہیں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اِن تمام عناصر سے ایسی معلومات بھی سامنے آتی ہے جو عام طور پر قاری کی نظروں سے او جھل ہوتی ہے۔ اِن عناصر کے ذریعے شخصیت کے تمام پہلوؤں کو سامنے لایا گیا ہے جس کے ذریعے بعض اوقات صاحبِ تذکرہ کے اُسلوب کو داد دینے پر قاری مجبور ہو جاتا ہے۔ تو بعض اوقات جس کا تذکرہ بیان کیا گیا ہے اس سے احترام اور محبت کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ احسان دانش نے اپنے عمیق مطالعے سے ایسے تذکرے بیان کر دیے ہیں کہ قاری ورطہ حیرت میں کھو جاتا ہے۔

"جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے شخصیات کی جو حُلیہ نگاری بیان کی ہے اُس کے ذریعے شخصیت کے باطنی خدوخال، ملبوس اور چال ڈھال پر معلومات مل جاتی ہے۔ احسان دانش چونکہ خود حساس شاعر ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ انسانی نفسیات پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ اور مُعاشرے میں جو کچھ دیکھتے ہیں اُس کو من و عن بیان کر دیتے ہیں۔ باطنی خدوخال ایک مشکل اور پیچیدہ عمل ہے اِس کے باوجود احسان دانش نے اسے بخوبی برتا ہے۔ باطنی خدوخال کے ساتھ ساتھ حُلیہ نگاری میں احسان دانش نے شخصیات کے لباس پر بات کی ہے۔ لباس کے ذریعے بھی شخصیات قاری کے سامنے واضح ہو کر آتی ہے۔ بعض اوقات انسان اپنے بارے میں کچھ چھپانا چاہتا ہے مگر لباس تمام احوال بیان کر دیتے ہیں۔ احسان دانش نے اس عُنصر کو بھی بخوبی بھرتا ہے۔ مثال کے طور پر احسان دانش جب نواب ملک امیر محمد خان کا تذکرہ کرتے ہیں تو اُس سے معلوم ہوتا ہے وہ جب برطانیہ منتقل ہو گئے تھے تو اُس کے باوجود وہ اپنے قومی لباس کو ترجیح دیتے تھے۔ جس سے اُن کی حب الوطنی قاری کے سامنے واضح ہو جاتی اور معلوم ہوتا ہے کہ وطن سے دوری کے باوجود وطن سے محبت ختم نہیں ہوتی۔ اِس کے علاوہ انہوں نے اس عُنصر کو بیان کرنے کے لیے تشبیہات اور دیگر فنی محاسن کا استعمال کیا ہے جس سے نثر میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

"جہانِ دِگر" میں احسان دانش نے حُلیہ نگاری میں چال ڈھال پر بھی بات کی ہے۔ باطنی خدوخال اور ملبوس پر تو کافی معلومات درج ہے مگر اس کے برعکس چال ڈھال پر کم گفتگو ملتی ہے۔ جن تذکروں میں چال ڈھال پر مصنف نے گفتگو کی ہے وہ شخصیات متحرک صورت میں قاری کے سامنے آ جاتی ہیں۔ چال ڈھال میں بھی مصنف نے فنی محاسن تشبیہات وغیرہ کا استعمال کیا ہے۔ اُسی کے ساتھ طنز و مزاح کے عناصر بھی قاری کے سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ پر وہ ابتذال والا حربہ اپناتے ہیں۔ جب وہ تبر شاہ کی چال ڈھال پر بات کرنے لگتے ہیں تو اس سے قبل وہ لکھتے ہیں کہ ایک شاخ میں اس کا ہیبت ناک اور چمکتا ہوا تبر لٹکا رہتا تھا جس سے تبر شاہ کی شخصیت قاری کے سامنے مسخ ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

احسان دانش کی تصنیف " جہانِ دِگر " میں شخصی عادات و خصائل کے حوالے سے بھی معلومات ملتی ہے۔

زیرِ بحث تحقیق کا تیسرا باب اِسی کے تجزیے پر مبنی ہے۔ " جہانِ دِگر " میں شخصی عادات اور اوصاف سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ زیرِ تحقیق عناصر میں معمولات و ترجیحات، طرزِ نشست و برخاست اور عادات و اطوار پر بحث کی گئی ہے اور اِس کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ معمولات و ترجیحات میں مصنف نے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جس سے قاری کو کوئی دِقت نہیں ہوتی اور وہ با آسانی صاحبِ تذکرہ شخصیت کے معمولات و ترجیحات سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔

طرزِ نشست و برخاست بھی صاحبِ تذکرہ شخصیت کو سمجھنے میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ فن مشکل ضرور ہے مگر احسان دانش نے " جہانِ دِگر " میں اِسے بخوبی برتا ہے۔ مثلاً جب وہ جمیلہ ہاشمی کا تذکرہ بیان کرتے ہیں تو اُن کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ادبی قسم کی نشستوں میں بھی شریک ہوتی ہیں اور اپنی عادت کے مطابق گوئی سے بھی نہیں چوکتیں۔ جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس عناصر کی وجہ سے شخصیات کی وہ تمام معلومات بھی سامنے آجاتی ہیں جو عام طور پر قاری نہیں جانتا ہوتا۔

شخصی عادات و خصائل کے باب میں عادات و اطوار کو بھی زیرِ بحث بنایا گیا ہے۔ " جہانِ دِگر " میں احسان دانش نے اپنے تذکروں میں شخصیات کی عادات و اطوار پر بات کی ہے۔ اور اِس حوالے سے کتاب میں کافی مواد موجود ہے۔ کسی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اُس کے اقوال اُس کی گفتگو اور اُس کے خاندانی پسِ منظر کو سمجھنا پڑتا ہے اور یہ تمام چیزیں عادات و اطوار کے ذریعے ہی سامنے آسکتی ہیں جن کو احسان دانش نے بخوبی برتا ہے۔ مثلاً حشمت آرا حجاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ تمباکو نوشی کی اِس قدر عادی ہو چکی ہیں کہ جب تک تمباکو منہ میں نہ ہو وہ صحیح بات نہیں کر سکتیں۔ اس کے علاوہ عادات و اطوار کو بیان کرتے ہوئے ان کی اِن کی نثر میں شاعرانہ پن بھی آگیا ہے چونکہ احسان دانش خود شاعر بھی ہیں لہٰذا ان کی نثر میں شاعرانہ جھلک کا ملنا معمولی سی بات ہے۔

زیرِ بحث تحقیق کا چوتھا باب احوال و آثار کا تجزیاتی مطالعہ پر مبنی ہے۔ اس باب میں شخصیت کی متوازن عکاسی، تہذیبی حقائق کی پیشکش اور شخصی تاثر کی پیشکش کو زیرِ بحث بنایا گیا ہے۔ شخصیت کی متوازن عکاسی مشکل اور پیچیدہ فن ہے۔ " جہانِ دِگر " میں اس کا استعمال کم ہی ملتا ہے مگر جتنا مواد موجود ہے وہ شخصیت کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ اس عُنصر کے ذریعے قاری کے سامنے صاحبِ تذکرہ شخصیت کے مثبت و منفی پہلو سامنے آجاتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے گویا قاری بیٹھ کر اپنے سامنے صاحبِ تذکرہ شخصیت کو دیکھ بھال رہا ہے۔ مثلاً، جب وہ فرخ امر تسری کا تذکرہ کرتے ہیں تو اِس میں علامتی انداز بھی اپناتے ہیں۔ جو ایک اچھے ادیب کی خاصیت ہے وہ فرخ

امر تسری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ پرانے قدیم ڈھچر قسم کے انسان تھے لیکن نہایت زندہ دل اور صاحبِ ذوق، اس اقتباس کے بعد قاری کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ احسان دانش کا مطالعہ کتنا عمیق تھا اور وہ صاحبِ تذکرہ شخصیت کے بارے میں بُری سے بُری بات بھی کتنی آسانی سے کر جاتے ہیں۔

زیرِ بحث تحقیق میں تہذیبی حقائق کی پیشکش کو بھی زیرِ بحث بنایا گیا ہے۔" جہانِ دِگر" میں اِس کا استعمال کئی کم اور کئی زیادہ ہے۔ تہذیبی حقائق کے ذریعے احسان دانش کے زمانے کے واقعات، رسم و رواج، روایات اور ادب سے آگاہی ملتی ہے۔

شخصی تاثر کی پیشکش کو بھی احوال و آثار کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے۔ لکھاری نے جو تاثر صاحب تذکرہ شخصیت سے حاصل کیا ہوتا ہے اُسی کو جب موضوعِ بحث بناتا ہے تو بہت سے واقعات، انکشافات اور بیانات قاری کے سامنے آ جاتے ہیں۔ احسان دانش نے اپنی تحریروں میں اس کا استعمال کیا ہے جس سے بخوبی ماہرانہ جھلکیاں شخصیات کے حوالے سے ہمیں مل جاتی ہیں اور قاری بھی ویسا ہی حظ صاحبِ تذکرہ شخصیت سے حاصل کرتا ہے جیسا مصنف نے اٹھایا ہوتا ہے۔ احسان دانش کی تحریروں میں یہ خاصیت موجود ہے۔

علاوہ ازیں " جہانِ دِگر" مختلف انسانوں کی ایک البم ہے۔ جس میں مختلف شخصیات کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خود نوشت نہیں بلکہ ایک تذکرے کی کتاب ہے۔ احسان دانش نے جن شخصیات کا تذکرہ کیا ہے اُن میں اکثر کے ساتھ تاریخ کا اہتمام نہیں کیا۔ اگر تاریخ کے حوالے سے چند اشارے مل جاتے تو اس کتاب کی اہمیت مزید بڑھ جاتی۔ کرادر نگاری کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو احسان دانش نے علماء، فن کار، صحافی، پولیس، اساتذہ پنجاب یونیورسٹی اور دیگر معلمین کے تذکرے قلمبند کیے ہیں۔ مُراد یہ کہ اُنھوں نے خاص وعام کے تذکرے قلمبند کیے ہیں۔ کئی تذکروں میں وہ غیر جانبدار نہیں رہے مگر جن تذکروں میں اُنھوں نے غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ تذکرے یوں محسوس ہوتے ہیں جیسے وہ قاری کے سامنے متحرک صورت میں آ گئے ہوں اور قاری اُن کو دیکھ بھال رہا ہے۔ یہی خصوصیت احسان دانش کو زیادہ و جاوید رکھے گی۔

زبان و بیان کے حوالے سے بھی یہ کتاب کامیاب ہے۔ اِس میں استعمال ہونے والی زبان عام فہم اور رواں ہے۔ جس کی گرفت سے قاری نکلنا بھی چاہیے تو نہیں نکل سکتا۔ احسان دانش چونکہ شاعر بھی ہیں لہٰذا اُن کی نثر میں شاعرانہ پن کی جھلک نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے نثر میں تشبیہ، استعارے اور مراعات النظیر کا خوب استعمال کیا ہے۔ جس سے اُن کی نثر بوجھل نہیں ہوتی بلکہ اِسے مزید خوبصورت بنا دیتی ہے۔ مختصراً یہ کہ احسان دانش اور اُس زمانے کی شخصیات کو سمجھنے کے لیے " جہانِ دِگر" بے حد اہم اور مُفید ہے۔ اِس کے علاوہ اِس کتاب سے احسان دانش کے زمانے کی تہذیب سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہی خصوصیات احسان دانش کو زندہ و جاوید رکھے گی۔

ب۔ تحقیقی نتائج:

اِس تحقیقی مقالے کے ذریعے تذکرے میں موجود خاکے کے عناصر کو سامنے لایا گیا ہے۔وہ نتائج درج ذیل ہیں:

ا۔"جہانِ دِگر" میں حُلیہ نگاری کو برتا گیا ہے۔اِس کے لیے مصنف نے فنی محاسن تشبیہات ، استعارات، مراعات النظیر وغیرہ کا استعمال کیا ہے۔اِس کے علاوہ مصنف نے طنزو مزاح کے عناصر کو بھی مدِ نظر رکھتے ہوئے ابتذال والاحربہ اپنایاہے۔بعض اوقات مصنف نے تذکرہ کرنے والی شخصیات کا بڑا بے رحم حُلیہ بیان کیا ہے۔مثلاً حبیب جالب پر لکھے گئے تذکرے میں احسان دانش بیان کیا ہے کہ اُن کا رنگ زرد شلغم جیسا تھا۔صحرائے عرب کی طرح کھوپڑی تھی۔ پیشانی سے گدی تک چندیا صاف،کچوری کی طرح گال تھے۔جس سے پتا چلتا ہے کہ احسان دانش نے موازنے کے ساتھ ظرافت، نئی اصطلاحات اور ذو معنی الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے حُلیہ نگاری کی نوعیت بیان کی ہے۔

۲۔" جہانِ دِگر" میں شخصی عادات وخصائل کی عکاسی بھی ملتی ہے۔باقی عناصر کے مقابلے میں "جہانِ دِگر" میں شخصی عادات وخصائل پر سب سے زیادہ مواد ملتا ہے۔اِس عناصر کے ذریعے معمولات وترجیحات، طرزِ نشست وبرخاست اور عادات پر احسان دانش نے معلومات فراہم کی ہیں۔اِس عناصر کو بیان کرنے کے لیے مصنف نے عام فہم الفاظ کا استعمال کیاہے۔اِس کے علاوہ عادات وخصائل کی عکاسی کرتے ہوئے شاعرانہ اُسلوب کی بھی جھلک ملتی ہے۔یہ عکاسی شدت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔شاعرانہ اُسلوب کے حوالے سے اختر شیرانی پر بیان کیے گئے تذکرے میں یہ مصرعہ ملتاہے۔توبہ تو میں نے کی تھی ساقی کو کیاہوا تھا۔یہ مصرعہ غالب کاہے۔مگر احسان دانش نے بطورِ تضمین اِسے اختر شیرانی کے تذکرے میں بیان کیاہے جس سے پتاچلتاہے کہ احسان دانش نے عادات وخصائل کو بیان کرنے کے لیے تضمین کا بھی استعمال کیاہے۔

۳۔" جہانِ دِگر"میں احوال وآثار کو بھی پیش کیا گیا ہے۔مصنف نے تذکرے کے آغاز میں اپنے بارے میں چند بنیادی باتیں کی ہیں اُس کے بعد پاکستان کے موجودہ حالات اور تقسیم کی وجہ سے بچھڑ جانے والے احباب کے احوال بیان کیے ہیں۔مصنف نے اِس عناصر کو بیان کرنے کے لیے جہاں شخصیات کے اوصاف قلمبند کیے ہیں وہی عیبوں سے بھی روشناس کرایا ہے۔اُس کے لیے مصنف نے شخصیات کے مُثبت اور منفی پہلو بھی بیان کیے ہیں۔علاوٗہ ازیں اِس عناصر کو بیان کرتے ہوئے علامتی انداز بھی ملتا ہے۔

ج۔سفارشات:

۱۔ احسان دانش چونکہ شاعر ہیں اور اُن کے اِس تذکرے میں شاعرانہ اُسلوب کی جھلک موجود ہے۔لہٰذا "جہانِ دِگر" کا اُسلوبیاتی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

۲۔ سوانحی ادب کی ذیلی اصناف کے تعین اور شناخت کے لیے تحقیقی کام کی گنجائش موجود ہے۔

۳۔تاریخیت کے تناظر میں"جہانِ دِگر" کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیاجاسکتاہے جس سے اُس عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات وواقعات کو پرکھاجاسکتاہے۔

۴۔ احسان دانش کے علاوہ دیگر تذکرہ نویسوں کے ہاں خاکے کے عناصر پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:

احسان دانش ، جہانِ دِگر،خزینہ علم و ادب ،الکریم مارکیٹ،اردو بازار،لاہور،۲۰۰۱ء

ثانوی ماخذ:

احسان دانش،جہانِ دانش،خزینہ علم وادب،الکریم مارکیٹ اروو بازار،لاہور،بار دوم، ۲۰۰۲ء

انورجمال،پروفیسر،ادبی اصطلاحات،نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،۲۰۱۴ء

انورسدید، ڈاکٹر،اردو ادب کی مختصر تاریخ،اے۔ایچ پبلشرز،لاہور،طبع اول،اپریل ۱۹۹۶ء

اسرائیل صدیقی،ڈاکٹر،یادگارمرزا فرحت اللہ بیگ،الوقار پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴ء

بشیر سیفی،ڈاکٹر،خاکہ نگاری فن اور تنقید،شاخسار پبلشرز،راولپنڈی،اشاعت اول،۱۹۹۰ء

حسن وقارگُل،ڈاکٹر،اردو سوانح نگاری،آزادی کے بعد،شعبہ اُردوجامعہ کراچی،کراچی،۱۹۹۷ء

سلیم اختر،ڈاکٹر،اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،سنگ میل پبلیکشنز،لاہور،۲۰۱۳ء

ساجدصدیق نظامی،مدثر جمیل،تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان وہند،جلد ششم،مشمولہ: خاکہ نگاری،پنجاب یونیورسٹی ،لاہور، اگست ۲۰۱۴ء

شمیم حنفی،پروفیسر،مقدمہ،اردو خاکہ،اردو اکادمی،دہلی، ۲۰۰۹ء

شمیم حنفی،پروفیسر، آزادی کے بعد دہلی میں اردو،اردو اکادمی دہلی،۲۰۰۹ء

شاہدحنائی،اردو خاکہ نگاری،فن ،تاریخ،تجزیہ،اکادمی بازیافت،اردوبازار،کراچی،پہلی اشاعت، فروری ۲۰۱۵ء

شمیم حنفی،ڈاکٹر،مرتب آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ،اردو اکادمی،دہلی،طبع چہارم،۲۰۰۴ء

صابرہ سعید،ڈاکٹر،اردوادب میں خاکہ نگاری،پہلا ایڈیشن،حیدر آباد،۱۹۹۷ء

غفورشاہ قاسم،ڈاکٹر،تدبیر حرف،مثال پبلیشرز،فیصل آباد ،۲۰۱۴ء

گلناربانو،ڈاکٹر،صوبہ سرحدمیں خاکہ نگاری، گندھارا ہندکواکیڈمی،پشاور،۲۰۱۶ء

محمدعمررضا،ڈاکٹر،اردو میں سوانحی ادب فن اورروایت،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۲ء

میر تقی میر،نکات الشعراء،انجمن ترقی اردو ،اورنگ آباد،دکن، ۱۹۳۵ء

محمدحسین آزاد،آبِ حیات ،عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ،۱۹۹۷ء

محمد حسین آزاد، آبِ حیات،اُتر پردیش،اُردو اکادمی، لکھنؤ چھٹا ایڈیشن،۲۰۰۳ء
مرزا غالب،اردوئے معلیٰ،جلد اول،ظفر سنز پرنٹرز،لاہور،۱۹۶۹ء
وہاب عندلیب ، قامت وقیمت،اعجاز پرنٹنگ پریس،حیدر آباد،۱۹۹۸۱ء
یحییٰ امجد،فن اور فیصلے،مکتبہ عالیہ،لاہور،طبع اول، ۱۹۶۹ء

لغات:

سلیم اختر، ڈاکٹر،تنقیدی اصطلاحات توضیحی لغت،سنگِ میل،لاہور،۲۰۱۱ء

مقالات:

عائشہ طلعت خلجی،اردو میں خاکہ نگاری،مشمولہ:اردو نثر کا فنی ارتقاء،مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری،پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۹۴ء

ویب گاہیں:

https://www. rekhtadictionary.com